ستمبر ۱۹۸۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- حقیقتِ جہاد
  امیر تنظیم اسلامی کا ایک اہم خطاب
- صدر ضیاالحق کی حادثاتی موت پر امیر تنظیم اسلامی کے تاثر

۱۹ اگست ۱۹۸۸ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

نام بھی اچھّا — کام بھی اچھّا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھّا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تار: صُوفی سوپ
ٹیلکس:
۳۹، فلیمنگ روڈ، لاہور۔ ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷ - ۵۴۵۲۳

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد	۳۷
شمارہ	۹
محرم الحرام	۱۴۰۹ھ
ستمبر	۱۹۸۸ء
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرتعاون	-/۵۰

ماہنامہ

میثاق

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا -	۶ - امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ -	۹ - امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ 〃 〃
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ -	۱۲ - امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ 〃 〃

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن - لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳

جنرل محمد ضیاء الحق کی حادثاتی موت پر امیرِ تنظیم اسلامی کے تاثرات

مرتب : عاکف سعید

امیرِ تنظیم اسلامی کے بعض ذاتی اور خاندانی کوائف ——— ۱۷

ان کے اپنے قلم سے

الھدیٰ (نشست ۴۵) ——— ۴۷

مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول، سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

حقیقتِ جہاد ——— ۵۹

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید : حافظ خالد محمود خضر

آخرت پر ایمان ——— ۷۱

محمد غوری صدیقی

قافلۂ انقلابِ اسلامی، قدم بقدم ——— ۷۹

تحریک نور بدیع الزماں نورسی (۲)

قاضی ظفر الحق

آدابِ معاشرت ——— ۸۵

رنج و غم کے مواقع پر بندۂ مومن کا طرزِ عمل

شیخ رحیم الدین

عرضِ احوال

صدر ضیاء الحق کی حادثاتی موت پر امیر تنظیم اسلامی کے تاثرات

صدر ضیاء الحق مرحوم کی حادثاتی شہادت کا واقعہ ۱۷ اگست کو پیش آیا ۔۱۹ اگست کے خطابِ جمعہ میں یہی جانکاہ حادثہ امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا موضوع تھا۔ خطاب کے نصف اوّل میں محترم ڈاکٹر صاحب نے صدر ضیاء کی موت کو شہادت کی موت قرار دیتے ہوئے اس عظیم سانحے پر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا تھا ۔ اور ملک و ملّت پر اس حادثے کے ممکنہ اثرات اور فوری اہمیت کے کاموں پر روشنی ڈالی تھی اور خطاب کے نصف آخر میں انہوں نے صدر ضیاء مرحوم کے ساتھ اپنے روابط اور دوطرفہ تعلقات پر وضاحت سے گفتگو کرتے ہوئے صدر صاحب کے اُن احسانات کا بطورِ خاص ذکر کیا تھا جو محترم ڈاکٹر صاحب کی تحریک اور خدمتِ قرآنی کے کام میں اُن کے لئے باعثِ تقویت ثابت ہوئے۔ خطاب کے پہلے حصے کا بھرپور ملخص محترم اقتدار صاحب کے قلم سے ہفت روزہ 'ندا' کے شمارہ ۲۶ کے ادارتی صفحات میں اور نصفِ ثانی کی تلخیص شمارہ ۲۷ میں 'منبر و محراب' کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی ۔ موجودہ حالات میں امیر تنظیم کا یہ خطاب چونکہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا افادہ عام کے لئے اسے ہفت روزہ 'ندا' کے شکریے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے ۔

(ادارہ)

(۱)

پاکستان ہفتہ رفتہ میں ایک بحران اور ہیجانی کیفیت سے گذرا ہے۔ صدر مملکت اور چیف آف آرمی سٹاف' جنرل ضیاء الحق ایک حادثے سے دوچار ہوئے اور افواج پاکستان کے قیمتی افسروں اور جوانوں کی ایک معتدبہ تعداد کے علاوہ امریکی سفیر اور فوجی افسروں کے ساتھ خود بھی لقمہ اجل بن گئے۔ یہ سانحہ بذات خود بھی بہت بڑا تھا لیکن جونہی ایسے شواہد سامنے آئے جن سے اس کا ایک تخریبی کارروائی کا نتیجہ ہونا تقریباً ثابت ہو گیا' قوم کے غم واندوہ میں کئی گنا اضافہ ہوا اور لوگوں نے بجا طور پر ان کی شہادت کو اپنی پیشانی کا جھومر سمجھنا اور دشمنوں کے عزائم پر تشویش کا اظہار شروع کر دیا۔ حادثے کی تحقیقات جاری ہیں اور اگر اس میں رازداری نہ رکھی گئی تو صرف یہ معلوم ہونا باقی ہے کہ ملک دشمنوں کے کس گروہ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے طریقہ کون سا اختیار کیا تھا ورنہ اگلے ہی روز کراچی میں تیل کی تنصیبات پر راکٹوں اور میزائلوں کے حملے نے یہ راز طشت از بام کر دیا کہ اب ملک کو نئی طرز کی اور خوفناک تخریب کاری کا سامنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ہمیں اس حملے کے عواقب سے محفوظ رکھا ورنہ جو تباہی لانے کا ارادہ کیا گیا تھا' وہ واقعی بہت بڑی ہوتی۔

جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سال تک کوس لمن الملک بجاتے یوں اچانک منظر سے ہٹ جانے کو کسی نے بھی معمولی واقعہ قرار نہیں دیا۔ بین الاقوامی سطح پر قابل ذکر لوگوں کا ردعمل اور ذرائع ابلاغ کے تبصرے شاہد ہیں کہ اس واقعہ کو اور اس کے اثرات کی شدت کو ہر جگہ پوری طرح محسوس کیا گیا ہے۔ ملک کے اندر بھی ہر سیاسی جماعت اور مسلکی گروہ نے' معاشرے کے ہر طبقے اور پیشہ ورانہ تنظیم نے اور رائے عامہ کی نمائندگی کرنے والے سب ہی چھوٹے بڑے سیاسی' مذہبی اور سماجی راہنماؤں نے اس پر رائے زنی کی ہے۔ ملکی اخبارات و جرائد کو تو ظاہر ہے کہ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ ہم جب لکھنے بیٹھے تو امیر تنظیم اسلامی پاکستان' برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا تازہ خطبہ جمعہ ہمیں اپنے دل ودماغ کی مراد محسوس ہوا اور ہم نے کسی تکلف میں پڑنے کی بجائے مناسب سمجھا کہ اپنے اداریئے میں انہی کے جذبات و خیالات کی ترجمانی پر بس کریں کہ ہم بھی کہنا یہی کچھ چاہتے تھے چاہے اس خوبی سے اپنا مافی الضمیر بیان نہ کر سکتے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

گذشتہ سات سال سے ہمیں جنرل صاحب کی پالیسیوں سے شدید اختلاف رہا ہے اور ہم نے بلا جھجک اس کا اظہار کیا۔ "ندا" کی فائل بھی جسے شائع ہوتے ابھی صرف چھ ماہ ہوئے ہیں' گواہ ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں نہ کسی رورعایت سے کام لیا اور نہ نتائج کی پرواہ کی اور

لوگوں نے اس طرز عمل کو ہمارے احساس کی شدت پر محمول کیا ہو تو عجب نہیں۔ لیکن جس پالیسی کو وہ لے کر چل رہے تھے اس کے دونوں پہلوؤں پر ہم نے ہمیشہ احقاق حق اور ابطال باطل کے جذبے کے ساتھ اور اپنے اللہ اور ضمیر کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داری کے تحت لگی لپٹی رکھے بغیر بات کی ہے۔ ان کی خارجہ پالیسی کو جو بحیثیت مجموعی فی الحقیقت بھٹو مرحوم ہی کے بنائے ہوئے خطوط پر چلتی رہی ہے' ہم نے ملک کے مفاد میں سمجھا اور اس میں جو ایک نیا عامل ان کے اپنے دور میں شامل ہو' اس پر ان کی حکمت عملی کو خراج تحسین پیش کرنے میں بھی ہم پیچھے نہ رہے۔ ہم نے ان صفحات میں جہاد افغانستان میں ان کی عزیمت اور کردار کی پختگی کا اعتراف کرتے ہوئے اس تاریخی جدوجہد میں کامیابی کا سہرا ان کے سر باندھا۔ افغانیوں نے اگر جاں فروشی' شجاعت اور جذبۂ ایمان کے ایک روشن باب کا اضافہ تاریخ اسلام میں کیا ہے تو جنرل ضیاء نے ان کی پشت پناہی' ان کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے' دنیا بھر کی توجہ اس طرف منعطف کرانے اور سیاسی میدان مارنے کے علاوہ ان کے خاندانوں اور مہاجرین پر مشتمل لاکھوں مسلمانوں کو اپنے ملک میں ٹھکانا دے کر ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔ ہماری تنقید کا ہدف ان کی اندرون ملک پالیسی تھی جسے ہم نے شعوری طور پر اور دلیل و برہان کے ساتھ ملک اور اسلام کے لئے مہلک اور سخت نقصان دہ سمجھا۔ ہمارے نزدیک سابق وزیراعظم کی ناکامی بھی داخلی محاذ پر ہی الم نشرح ہوئی تھی ورنہ خارجہ حکمت عملی میں تو وہ بھی بہت نام کما گئے۔ وہ عالم اسلام کی آنکھ کا تارا سمجھے گئے اور شاہ فیصل شہید جیسے سنجیدہ اور متدین حکمران بھی انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے پوری دنیا میں مسلم ممالک کے زعماء بین الاقوامی مسائل پر رہنمائی اور ماہرانہ رائے کے لئے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ کسی کی چند خوبیوں سے متاثر ہو کر اس کے ہر برے کام پر ڈھکن رکھ دینا افراط ہے اور چند خامیوں کی وجہ سے سب بھلائیوں پر پانی پھیر دینا تفریط۔ ہم اس ناپسندیدہ اور غیر معتدل طرز عمل سے بچتے ہوئے جنرل ضیاء کی داخلی حکمت عملی پر تیز و تند تنقید کرتے رہے ہیں۔

لیکن اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں اور ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرنا ہے کہ اپنے فوت شدگان کا ذکر اچھے انداز میں کیا کرو۔ ہمارے لئے اصل رہنما اصول تو یہی ہے تاہم ایک ضمنی بات یہ بھی ہے کہ ہم جنرل ضیاء کے بارے میں یا کسی بھی اور شخص کے متعلق اس کے ظاہر کے مطابق رائے قائم کرنے اور بیان کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم ان کے اچھے کاموں اور برے کاموں کی نوعیت اور اثرات وہی سمجھنے پر قادر تھے جو کچھ کہ وہ نظر آتے رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ نیت کے مطابق ہو گا۔ حضور اکرمؐ کا وہ قول مبارک جس سے حدیث کے ہر مجموعے کا آغاز ہوتا ہے' بہت مختصر اور سادہ لیکن حد درجہ

حکیمانہ ہے..... "بے شک اعمال کا مدار نیتوں پر ہے" ..... ہم پر ان کی اور کسی کی بھی نیت آشکار نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک وہ ہم میں موجود تھے' ہم نے ان کے ظاہر پر تنقید کی' لیکن اب یہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ وہ اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں جو ان کی نیت کا حال بھی جانتا ہے اور یہ بھی کہ اس نے انہیں کیا صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجا تھا اسے معلوم ہے کہ کیا مواقع کن حالات میں انہیں مہیا کئے گئے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں اگر ان سے کوتاہی ہوئی تو اس کے اصل اسباب و محرکات کیا تھے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی علیم و خبیر ذات ہی کے علم میں ہیں اور دین نے ہمیں سکھایا ہے کہ انہی کی روشنی میں ان کا محاسبہ ہو گا۔ وہاں کے پیمانے بھی یقیناً یہاں کے اندازوں سے مختلف ہیں۔ ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے' ان پر رحم کھائے' انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے اور حساب کتاب کو ان کے لئے آسان کر دے۔ رب کریم ان کی قبر کو روشن رکھے' انہیں عزت والے مقام میں ٹھکانا دے اور انہیں اپنے صالح بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین۔

ہم اس موت کو ان کے لئے اور ان کے سب مسلمان ساتھیوں کے لئے آخرت کے اعتبار سے خیر کا موجب سمجھتے ہیں اور بالخصوص جنرل ضیاء کی ذات کے لئے اسے دنیاوی پہلو سے بھی بہت اچھی اور خوش آئند قرار دیں گے۔ وہ سب وردی میں تھے' اپنے فرائض کی بجا آوری کی غرض سے سفر پر گئے اور دفاع وطن کے مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے ضروری ساز و سامان اور مہارت کی فراہمی کے بارے میں تسلی کر کے اپنے بال بچوں کے حقوق ادا کرنے واپس آ رہے تھے کہ اچانک حادثاتی طور پر قضا نے آلیا۔ ہمارے دین کی تعلیم کے مطابق انہوں نے شہادت پائی ہے اور جب تفصیلات سامنے آئیں اور یہ بات یقینی معلوم ہونے لگی کہ وہ حادثے ہی کے نہیں' تخریبی کارروائی کے بھی شکار ہوئے ہیں تو ان کی موت زیادہ ہی نفع کا سودا ہو گئی۔ ہاں ہم ان کے لئے اسے نفع کا سودا قرار دیتے ہیں' اس لئے کہ ہمارے نزدیک زندگی' قوت کار' مواقع اور صحت و تندرستی سب کی سب مآل کار انسان کے لئے حساب کتاب کی اصطلاح میں ذمہ داریاں (LIABILITIES) ہیں اور اثاثہ یعنی (ASSET) فی الحقیقت صرف وہ ہے جو ساتھ چلا جائے جو اثاثہ یہ حضرات لے گئے ہیں وہ انشاء اللہ ان کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں بھاری رہے گا اور وہ اللہ کے فضل سے فائدہ میں رہیں گے۔ تخریب کاری نے انہیں شہید ہی نہیں' مقتول بھی بنا دیا ہے اور مقتول کو ہابیل و قابیل کے واقعہ کے ضمن میں اس نص قرآنی سے یہ اضافی فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں کا بوجھ بھی قاتل اپنے سر لے گا۔ جنرل ضیاء کی موت کو ہم ان کی دنیا کے لئے قابل رشک کہتے ہیں۔

یوں کہ اس موت نے انہیں جو اعزاز و اکرام دیا اور جس والہانہ محبت و عقیدت کے

اظہار کے ساتھ ہموطنوں نے انہیں سفر آخرت پر روانہ کیا' اس کا عشر عشیر بھی انہیں بعد میں نہ مل سکتا تھا۔ ان کے خلاف ایک عوامی تحریک اٹھنے کے واضح امکانات تھے اور ماضی میں حکمرانوں کے خلاف جب بھی روایتی ردعمل کا اظہار شروع ہوا' اس میں معقولیت اور شائستگی نے راہ نہ پائی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں خود یہ کہا تھا کہ گیارہ سال سے لوگ میرا چہرہ دیکھتے تنگ آ گئے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں کس صورت حال کا سامنا ہوتا تاہم بھلائی کی امید بہت کم تھی۔ وہ اس ناخوشگوار انجام سے صاف بچ گئے۔

ملک و قوم کے مستقبل کے حوالے سے ہم تخریب کاری کے اس نئے ڈھنگ پر تشویش کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ واقعہ اور اگلے روز کراچی میں تیل کی تنصیبات پر حملہ جس تیور کی غمازی کرتا ہے وہ ماضی کے واقعات سے مختلف ہے۔ پہلے دھماکوں سے مقصود خوف و ہراس پھیلانا تھا' اب ان کا نشانہ حساس ترین مقامات ہیں بلکہ ملک کی شہ رگ ہدف ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی اور دشمن طاقت نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اب اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ سیاسی جماعتوں کو بھی پرانی باتیں بھول کر قومی یکجہتی اور ملکی سلامتی کی بات کرنی چاہئے۔ ایک باب تھا جو بند ہو گیا' اب دلوں سے غبار اور عناد کھرچ کر نکال دیا جائے۔ سیاسی اختلاف کو مبالغہ آرائی سے بچانا اور مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینے سے باز رہنا وقت کی ضرورت ہے۔ پہلے بھی تھی' اب کہیں زیادہ ہے۔ دشمنوں کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ سیاسی اختلافات اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا میں چنگاری پھینک کر آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اب تو یہ بات بھی خاصے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علامہ عارف حسین حسینی کا قتل بھی تخریب کاری کے اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جذبات کی شدت پر تیل چھڑکنے کا ملک دشمن منصوبہ مؤثر نہ ہوا۔ اور اس کے اثرات اگر اب بھی کہیں محسوس کئے جا رہے ہیں تو انہیں حکمت اور دور اندیشی سے دور کیا جانا چاہئے۔ اندیشہ ہے کہ ایسے حوادث آئندہ ہمیں زیادہ تیزی سے گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے جس سے نکل سکنے میں ہماری ساری امیدیں قومی اتحاد' یکجہتی' حب وطن اور اللہ تعالیٰ کی اعانت سے وابستہ ہیں۔

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی سطح پر اس ناگہانی صورت حال میں جو انتظام سوچا گیا وہ دستوری اور آئینی ہے۔ جن حضرات نے بھی یہ فیصلہ کیا' اچھا کیا اور ہمیں اس سے بحث نہیں کہ فیصلہ کا اختیار انہیں کیسے حاصل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک و ملت کی قسمت ان کے ہاتھوں میں دے دی تھی' وہ کوئی غلط طرز عمل بھی اختیار کر سکتے تھے اور اس بات کی ہرگز ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ ان کے اگلے سب اقدامات بھی درست اور صائب ہی ہوں گے لیکن ان

سے درخواست ضرور کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کی مصلحت کو ہر ذاتی اور گروہی مفاد سے بالا رکھیں۔ ہم ان کے لئے توفیق اور استقامت کی دعا کریں گے۔ ان کا یہ پہلا فیصلہ درست ہے' اللہ چاہے تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ فوج اس موقع پر ایک بڑے حادثے کی آڑ میں مارشل لاء لگا سکتی تھی جس کا عوامی ردعمل بھی حالات کی نزاکت کے باعث متوقع نہ تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ انہوں نے بھی ملک کی گاڑی کو دستور کی پٹڑی پر چلانے کے فیصلے میں سول انتظامیہ کو مدد ہی دی۔

ہماری فوج کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ وطن عزیز کے دفاع کے لئے قوم کو ایک خالص پیشہ ور (PROFESSIONAL) فوج درکار ہے۔ ہماری ضرورت بلکہ مجبوری ہے کہ عوام کو اپنی فوج سے محبت ہو۔ اشتراک اقتدار کی آرزو دل میں رکھ کر خدا کے لئے وہ محبت کو نفرت میں بدلنے کا جواز نہ مہیا کریں اور ہم سادہ دلیل سے بتائیں گے کہ اقتدار و حکومت میں شریک بن کر وہ اگر آبادی کے ایک حصے کے مفادات کا تحفظ کر کے محبت کے حقدار بنتے ہیں تو دوسرے حصے میں احساس محرومی کی افزائش کا باعث بنتے اور نفرت کی علامت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ہم نے پچھلے شمارے کے اداریئے میں جنرل ضیاء الحق سے بھی یہی عرض کیا تھا اور اب قدرے تفصیل سے کہتے ہیں کہ ملک خداداد کے حالات برادر ملک ترکی سے بہت مختلف ہیں وہاں سرحدوں سے ملحقہ تھوڑے سے علاقوں کو چھوڑ کر ملک کے بیشتر اور وسطی رقبہ پر ہر اعتبار سے ایک باہم مربوط قوم آباد ہے۔ نسل ایک' زبان ایک اور دین ایک اور وہاں تو مذہبی اور مسلکی اختلاف کا بھی نام و نشان نہیں۔ پوری قوم فقہ حنفیہ کی پابند اور تصوف کے ایک ہی سلسلے سے منسلک ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کی جڑیں صرف وہیں بہت گہری نہیں' روسی ترکستان میں بھی موجود ہیں۔ وہاں کی فوج بھی ملک کی عظیم اکثریت کی نمائندہ ہے' اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اگر ملک کے انتظام پر قابض ہو جائے یا اقتدار میں حصہ طلب کرے تو کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے افراد کا تعلق ملک کی غالب آبادی سے ہے۔ ہمارے ہاں کا نقشہ تقریباً برعکس ہے۔ دین کے سوا قوم میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ نہ نسل ایک' نہ زبان ایک' نہ تہذیب و تمدن ایک اور نہ جغرافیائی حالات یکساں اور اس پہ قیامت یہ کہ فوج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے ملک میں ایک واضح تقسیم نظر آتی ہے۔ شمال بلکہ شمال کے بھی بالائی حصے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ تقریباً پوری فوج کا تعلق اسی خطہ سے ہے جبکہ ملک کے جنوبی حصے یعنی سندھ اور بلوچستان بلکہ ایک حد تک جنوبی پنجاب کی آبادی کا بھی افواج پاکستان میں وجود شاذ کے حکم میں آتا ہے' نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس تناظر میں فوج کا اقتدار سنبھالنا یا حکومت میں شریک ہونا شمال کی جنوب پر بالادستی قرار پاتا ہے۔ قوم کا ایک حصہ اپنے آپ کو محکوم سمجھنے پر

مجبور ہو جاتا یا کر دیا جاتا ہے' احساس محرومی کو کالی زبان مل جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے وہی علاقے حساس ہیں اور دشمنوں کو لقمۂ تر نظر آتے ہیں۔ وہاں اگر مقامی آبادی سے ملک کا دفاع کرنے والوں کو عزت و وقار بلکہ محبت اور امداد و تعاون نہ ملے تو ہماری ناقص رائے میں کیل کانٹے سے لیس اور عددی لحاظ سے مضبوط و مرتب فوج بھی دشمنوں کا راستہ روکنے میں کامیاب نہ ہوگی۔

ہم ایک بار پھر ذمہ داران حکومت اور زعمائے سیاست کی توجہ کے لئے اپنی بات دہراتے ہیں کہ تخریبی کارروائیوں کا جو سلسلہ اب شروع ہوا ہے' اسے معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ دیو ہیکل سی۔ ۱۳۰ جیسے مضبوط جہاز کو گرا لینا جس کا نام ہی ہرکولیس ہے' آسان نہ تھا۔ اس نوع کی تخریبی کارروائیاں اگر بیرونی ہاتھوں نے کی ہیں تب افسوس کا مقام نہیں محض تشویش اور احتیاطی تدابیر کا مسئلہ ہے کہ اپنے ازلی دشمنوں سے ہمیں خیر کی توقع ہی کب تھی لیکن خدانخواستہ اگر یہ کسی اندرونی طاقت کی کارگزاری ہے یا اندرونی ہاتھ بھی اس میں شریک ہیں تو یہ بڑی ہی خوفناک بات ہے۔ ایسے لوگوں کو عوام الناس کی ہمدردی اور تائید و تعاون سے محروم کر دینا ہماری اولین ترجیح ہونی چاہئے۔ اس ہولناک عامل کی وجہ سے یا اس کے پردے میں ذمہ داران حکومت کی طرف سے کوئی غیر جمہوری کام نہ کئے جائیں۔ ہم صاف بات کرنا چاہیں گے کہ عام انتخابات ۱۶ر نومبر کو یا ممکن ہو تو اس سے پہلے آزادانہ' سیاسی اور خالص جماعتی بنیادوں پر کرائے جائیں اور کسی بھی سیاسی جماعت کو الیکشن میں حصہ لینے سے روکنے کی تدبیر آزمائی نہ جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی عظیم اکثریت بالعموم اور پرانی نسل بالخصوص آج بھی محب وطن ہے۔ جمہوریت کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور تحفظات کے بغیر خوش دلی سے دیا جائے تو انتخابی عمل پر بھی یہی محب وطن اکثریت اثر انداز ہوگی۔ بصورت دیگر جمہوری راستوں کی بندش توڑ پھوڑ' ہنگاموں اور تخریبی کارروائی کی راہیں کھولے گی جس کے لئے نوجوان نسل بڑی حد تک تیار کی جا چکی ہے اور بعض علاقوں میں آج بھی دندنا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی صورتحال سے وطن عزیز کو اپنی پناہ میں رکھے۔

(۲)

آج میں موقع کی مناسبت سے صدر ضیاء الحق صاحب کے ساتھ اپنے معاملے اور باہمی تعلقات کے ضمن میں وضاحتی نوعیت کی چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں' اور ان کے چند ذاتی احسانات کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے مجھ پر کئے۔ ویسے بھی ہمارے دین

کی تعلیم یہی ہے کہ فوت شدگان کا ذکر بھلے انداز میں کرنا چاہئے اور ان کی خوبیوں ہی کا ذکر ہونا چاہئے اور ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی میرے سامنے ہے کہ "جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا"۔ اور چونکہ گزشتہ کچھ عرصے سے میری جانب سے صدر ضیاء کی پالیسیوں کے بارے میں تنقیدی نوعیت کی باتیں ہی آپ حضرات کے سامنے آئی ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج ان کے احسانات کا ذکر کر کے اس معاملے کو بیلنس کر دوں۔ ساتھ ہی مجھ پر ان کی ایک ذاتی نوعیت کی زیادتی کا ذکر بھی محض اس اعتبار سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے قبل چونکہ میں نے متعدد بار تلخی کے ساتھ اپنے قریبی حلقوں میں اس کا ذکر کیا ہے' لہٰذا آج میں علیٰ رؤوس الاشہاد صاف دلی کے ساتھ انہیں معاف کرتے ہوئے اس زیادتی سے اس دنیا ہی میں ان کو بری کرنے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

ضیاء الحق صاحب کے ساتھ میرا اولین غائبانہ تعارف ۶۷ء میں ہوا جب میں نے "میثاق" کی ادارت سنبھالی۔ اُس وقت میرے علم میں یہ بات آئی کہ وہ ابتداء ہی سے میثاق کے مستقل قارئین میں شامل تھے۔ اُن دنوں وہ ملتان میں جی او سی تھے۔ گو اس زمانے میں ان سے ملاقات کا موقع تو نہ ہوا تھا لیکن "میثاق" کے ذریعے سے ہمارے مابین ایک ذہنی رابطہ گویا ۶۷ء سے موجود تھا۔ پھر انہی دنوں جب میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر "تدبر قرآن" کی جلد اول شائع کی اور ضیاء الحق صاحب کے بھیجنے پر ایک فوجی افسر اسے خریدنے کے لئے میرے دفتر میں آئے' تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہماری فوج میں اوپر کی سطح پر دینی تعلیم کا ذوق رکھنے والے آفیسرز موجود ہیں۔ اس دور کا ایک یہ معاملہ بعد میں میرے علم میں آیا' اور خود ضیاء صاحب نے اپنی بعض گفتگوؤں میں اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی مسجد خضراء میں میرے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ لیکن اُس وقت چونکہ وہ محض ایک سامع کے طور پر تشریف لاتے تھے اور ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لہٰذا ان سے براہ راست تعارف حاصل نہ ہو سکا۔

ان سے دوسرا رابطہ' اور یہ بھی براہ راست نہیں تھا' نومبر ۷۷ء میں ہماری چوتھی سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر ہوا۔ اُن دنوں جنرل صاحب نے تازہ تازہ اقتدار سنبھالا تھا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے قبل رات کو اچانک جنرل صاحب کا فون آیا کہ وہ قرآن کانفرنس کے لئے اپنا پیغام بھجوانا چاہتے ہیں۔ اور وقت کی کمی کے پیش نظر تحریری صورت میں پیغام بھجوانے کے بجائے وہ ٹیلی فون ہی پر اپنا پیغام DICTATE کرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ

جنرل صاحب کی ہدایت پر بریگیڈئر صدیق سالک نے' جواب ان مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں جنہوں نے صدر ضیاء کے ساتھ شہادت پائی' ٹیلی فون پر صدر صاحب کا پیغام لکھوایا جو اگلے دن کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ میرے لئے ضیاءالحق صاحب سے براہ راست گفتگو کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری کانفرنس میں کسی اہم سرکاری عہدیدار کا پیغام پڑھ کر سنایا جانا ایک غیر معمولی بات تھی' اس لئے کہ الحمدللہ ہمارا شروع سے یہ معاملہ رہا ہے کہ ہم نے اپنی کسی قرآن کانفرنس یا انجمن کی کسی تقریب میں کسی سرکاری عہدیدار کو مدعو کیا ہے نہ ان کے پیغامات حاصل کرنے کی سعی کی ہے چنانچہ اس پہلو سے ہمارا ادارہ اللہ کے فضل سے ہر قسم کے سرکاری اثرات سے بالکل پاک رہا ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک ضیاءالحق صاحب چونکہ نہ صرف یہ کہ دینی و مذہبی مزاج رکھتے تھے بلکہ ان کی ابتدائی تقاریر میں اسلام کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا بھرپور اظہار بھی ہوا تھا لہٰذا میں نے قرآن کانفرنس میں ان کا پیغام پڑھ کر سنایا لیکن ساتھ ہی میں نے دوٹوک انداز میں یہ بھی عرض کر دیا تھا' اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ ضیاءالحق صاحب آپ بہت بڑی ذمہ داری کے بوجھ تلے آ گئے ہیں' اب آپ کے ذمے ہے کہ پاکستان میں اسلام کو نافذ کریں اور پورے اسلام کو نافذ کریں' ادھورا اسلام اللہ تعالیٰ کو کھلے کفر سے زیادہ ناپسند ہے۔ میں نے اس موقع پر زور دے کر یہ عرض کیا تھا کہ پورے دین کو نافذ کیجئے اور تدریج کے چکر میں نہ پڑیئے۔ تدریج اس وقت درست تھی جب شریعت نازل ہو رہی تھی۔ اب دین مکمل ہو چکا' شریعت کی تکمیل ہو چکی لہٰذا تدریج کی بات کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ ساتھ ہی میں نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر آپ یہاں مکمل اسلام کے نفاذ کی کوشش کریں گے اور اس سلسلے میں ہر ممکن قدم اٹھانے کا عزم کریں گے تو یہ معاشرہ آپ کو برداشت نہیں کرے گا اور اٹھا کر پھینک دے گا۔ لیکن یہ بات آپ کے لئے انتہائی خوش آئند اور مبارک ہوگی کہ آپ اقتدار چھوڑنا گوارا کر لیں لیکن دین و شریعت کے ساتھ اپنی وابستگی سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں۔ میں نے مثال دی تھی کہ بیسویں صدی میں ایک برطانوی بادشاہ ایک عورت کی محبت میں اگر تخت حکومت کو ٹھوکر مار سکتا ہے تو اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی کی وجہ سے اگر کوئی حکمران حکومت سے دستبردار ہونے کی مثال قائم کر دے تو یہ واقعتہً ایک بڑی بات ہوگی۔

جنرل ضیاءالحق صاحب کے ساتھ براہ راست ملاقات کا موقع اگست ۱۹۸۰ء میں علماء

کنونشن کے موقع پر ملا۔ مجھے کنونشن میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو میں نے شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس قسم کی تقاریب میں شرکت کے ساتھ میری طبعی مناسبت ہی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ میرے پاس عذر موجود تھا کہ ۲۰ر اور ۲۱ر اگست کی درمیانی شب مجھے اپنے سفر امریکہ پر روانہ ہونا تھا اور ۲۰ر اگست ہی کو علماء کنونشن کا آغاز ہونا تھا۔ صدر صاحب کی طرف سے پیغام آیا کہ اگر آپ کنونشن میں شریک نہیں ہو سکتے تو ۱۸ر اگست کے مشاورتی اجلاس میں ضرور شرکت کیجئے جو کنونشن ہی کے سلسلے میں منعقد ہو گا۔ اب میرے پاس عدم شرکت کے لئے کوئی عذر نہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر صدر صاحب کے ساتھ مسلسل آٹھ گھنٹے اجلاس میں شریک ہونے کا موقع ملا اور چونکہ معدودے چند افراد ہی اس مشاورتی اجلاس میں شریک تھے لہٰذا بہت قریب سے صدر صاحب کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس اجلاس میں میرا ایک مشورہ تو انہوں نے صدفی صد قبول کیا' حالانکہ دیگر تمام غیر فوجی شرکاء کی رائے میری رائے سے مختلف تھی۔ مشورہ طلب معاملہ یہ تھا کہ کنونشن کا نہج کیا ہو؟ اسے کس طور پر CONDUCT کیا جائے۔ تمام لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس میں ضیاء صاحب کو مفصل تقاریر کرنی چاہئیں کہ لوگ تو ان ہی کو سننا چاہتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کنونشن میں صدر صاحب کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ اولاً وہ اس تقصیر کا اعتراف کریں کہ تین سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک شریعت کی جانب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا نہیں جا سکا۔ اور ثانیاً یہ کہ صدر صاحب کو اس کنونشن میں بطور سامع کے شریک ہونا چاہئے کہ وہ علماء سے پوچھیں اور معلوم کریں کہ ابھی تک شریعت کے سلسلے میں جو ابتدائی نوعیت کے اقدامات کئے گئے ہیں ان کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے! وہ ان اقدامات کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں! میں حیران ہوا کہ صدر صاحب نے میری رائے کی تصویب کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ کنونشن اسی طور سے منعقد ہو گی۔ بلکہ صدر صاحب نے مجھے کنونشن میں شرکت کے لئے مجبور کرتے ہوئے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ ۲۰ر اگست کے اجلاس میں شریک ہو جائیں' میرا فالکن طیارہ آپ کو اسی رات کراچی پہنچا دے گا۔ اس پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے قبول کرنے سے تو میں نے معذرت کر لی لیکن ان کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے پروگرام میں اس طرح تبدیلی کی کہ ۲۰ر تاریخ کے اجلاس میں شرکت کے بعد بذریعہ پی آئی اے اسلام آباد سے سیدھا کراچی روانہ ہو گیا۔

دوسرا مشورہ میں نے زکوٰۃ آرڈیننس کے بارے میں دیا تھا کہ خدارا اس آرڈیننس کے

ذریعے ناواقف سُنّیوں کو شیعہ بنانے کا راستہ نہ کھولئے اس لئے کہ اگر آپ نے اس آرڈیننس سے شیعہ حضرات کو مستثنیٰ قرار دیا تو یہ چیز بے شمار سُنّیوں کے شیعہ بن جانے کا باعث ہوگی۔ لہٰذا اس شکل میں آرڈیننس نافذ کرنے سے یہ بہتر ہوگا کہ اسے واپس لے لیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا یہ مشورہ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ اپنے اس فیصلے کی مصلحتوں سے وہ خود ہی بہتر طور پر واقف ہوں گے۔ بہرکیف میں نے ان واقعات کا تذکرہ اس اعتبار سے کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ان کے میرے ساتھ معاملے کی نوعیت کیا تھی۔

پھر جب میں امریکہ میں تھا تو مجھے بتایا گیا کہ حکومت پاکستان کو میری تلاش ہے۔ معلوم ہوا کہ صدر صاحب کو یُو این او میں تقریر کرنا تھی اور وہ اپنے وفد میں مجھے شامل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ امریکہ میں مجھ سے رابطہ کیا گیا اور صدر صاحب کی خواہش مجھ تک پہنچائی گئی۔ یہ میرے ساتھ صدر صاحب کے حسن ظن کا بہت بڑا مظہر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کر لی کہ میں اپنے آپ کو اس وفد میں شامل ہونے کا اہل نہیں پاتا۔

اس کے بعد صدر صاحب کی مجھ پر ذاتی حیثیت میں عنایات کا ایک بڑا مظہر یہ سامنے آیا کہ مجھے مرکزی وزارت کی پیشکش کی گئی۔ صدر کے ایک قریبی عزیز کرنل نور الٰہی صاحب نے، جو بہت عمدہ سرجن اور بہت نفیس انسان ہیں، صدر صاحب کی یہ آفر مجھ تک پہنچائی۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اس قسم کی ذمہ داریوں کا تجربہ ہے نہ میں اس کا اہل ہوں۔ ساتھ ہی میں نے بطور عذر یہ دلیل بھی دی کہ مارشل لاء حکومت میں کسی سویلین وزیر کا دائرہ کار اور اختیارات اتنے محدود ہوتے ہیں کہ وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا لیکن خرابی کا سارا الزام اُسی کے سر آتا ہے۔

اس کے بعد مرحلہ آیا مجلس شوریٰ کا۔ اس پیشکش کو نہ قبول کرنے کا میرے پاس کوئی عذر نہیں تھا چنانچہ میں نے اس آفر کو قبول کیا۔ میری دلیل یہ تھی کہ یہ حکومت میں شمولیت کی صورت نہیں ہے بلکہ صرف مشورے کا معاملہ ہے۔ تمام اختیارات مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ہاتھوں میں ہیں اور تمام ذمہ داری اسی کی ہے۔ ہم نے اس ملک کے شہری کی حیثیت سے اگر اس حکومت کو طوعاً یا کرھاً قبول کیا ہے یا کم از کم اس کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند نہیں کیا تو ایسی حکومت اگر مشورہ طلب کرتی ہے تو خیر کا مشورہ دینے اور غلط بات پر ٹوکنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ یہ تو ہر شہری کا اخلاقی فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ حکومت کے مشورہ طلب کرنے پر مشورہ دے۔ میں نے اس وقت عرض کیا تھا کہ میں اپنی مسجد کے منبر پر کھڑا ہو کر صدر صاحب

کی پالیسی پر تنقید کرتا ہوں یا انہیں مشورے دیتا ہوں تو اگر وہ مجھے اپنے قریب آ کر مشورہ دینے کی دعوت دیتے ہیں تو کم از کم میرے پاس ان کی پیشکش کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے جب وہاں مشورے کی فضا کو مفقود پایا اور پارلیمانی انداز کی کھینچ تان میں وقت کو ضائع ہوتے دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ صدر صاحب ہمارے مشوروں پر سنجیدگی سے سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں تو کُل دو ماہ بعد ہی صدر صاحب کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا۔

اب میں صدر صاحب کے اُن چند ذاتی نوعیت کے احسانات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری تحریکِ قرآنی کے کام کو آگے بڑھنے میں بہت مدد ملی۔ اور ان احسانات کا بار میں ذاتی طور پر اپنے کاندھوں پر محسوس کرتا ہوں۔ ان میں نمایاں ترین معاملہ ٹی وی پروگرام "الھدٰی" کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ملک میں ایسے خالص دینی پروگرام کا ترتیب دیا جانا ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر صدر صاحب اس میں ذاتی دلچسپی نہ لیتے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ہمارے سرکاری ذرائع ابلاغ پر جس ذہن اور جس مزاج کے لوگوں کا غلبہ ہے' یہ پروگرام ان کے سینوں پر سانپ کی طرح لوٹ رہا تھا۔ قرآن کے انقلابی فکر کا مسلسل پندرہ ماہ تک ٹی وی پر نشر ہونا ان لوگوں کو کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دین کی خدمت کے جس کام کو لے کر میں چل رہا ہوں اس کے اعتبار سے یہ صدر صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ اگرچہ ۷۹ء کے رمضان المبارک میں ٹیلی ویژن پر "الکتاب" کے نام سے میرے درسِ قرآن کا جو پروگرام نشر ہوا تھا اس میں ضیاء الحق صاحب کا ہاتھ نہ تھا بلکہ ٹی وی کے ایک سینئر پروڈیوسر کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے وہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ ۸۰ء کے رمضان کے دوران بھی یہی پروگرام ٹی وی پر دوبارہ نشر کیا گیا اور اس سے اگلے سال الف لام میم کے عنوان سے پروگرام ریکارڈ کیا گیا جو رمضان المبارک کے دوران نشر ہوا۔ پھر مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے "الھدٰی" پروگرام کی تجویز پیش کی گئی جس سے ضیاء الحق صاحب نے صدفی صد اتفاق کرتے ہوئے اس کے اجرا کا حکم دیا اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے مسلسل پندرہ ماہ یہ پروگرام جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر صدر صاحب کا خصوصی حکم نہ ہوتا تو اس پروگرام کا آغاز ہی نہ ہو پاتا۔ اس لئے کہ بالکل آغاز ہی میں خواتین کی شرکت کے مسئلے پر معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ میں مُصِر تھا کہ اگر خواتین اس پروگرام میں شرکت کرنا چاہیں تو انہیں پردے میں ہونا چاہئے' وہ برقعہ اوڑھ کر پروگرام میں شرکت کریں۔ جبکہ ٹی وی کے کارپردازان کو اس سے

شدید اختلاف تھا۔ بالآخر طے کرنا پڑا کہ خواتین کی شرکت کے معاملے کو ہی ختم کر دیا جائے۔ بہرکیف " الھدٰی " پروگرام کے معاملے کو میں اپنے اوپر اور اپنی تحریک پر صدر صاحب کا بہت بڑا احسان سمجھتا ہوں اور اس احسان کا علیٰ رؤوس الاشہاد اعتراف کرنا اپنا اخلاقی فریضہ خیال کرتا ہوں۔

پھر میرے ساتھ ان کے حسن ظن اور تعلق خاطر کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ ستارۂ امتیاز پانے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل کیا گیا۔ اور اگرچہ وہ شاید اس بات سے ناراض ہوئے ہوں گے کہ میں اس تقریب میں شریک نہ تھا جس میں یہ ایوارڈ تقسیم کیا گیا۔ لیکن مجھے چونکہ بحمداللہ اس قسم کے دنیاوی ایوارڈز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ویسے بھی اس قسم کی مجالس میں شرکت میری طبع اور میرے مزاج کے خلاف ہے کہ کسی کے سامنے سر جھکا کر میڈل وصول کیا جائے کہ اس میں میرے نزدیک سجدۂ تعظیمی سے ایک گونہ مشابہت موجود ہے' لہٰذا مجھے اس تقریب میں نہ جانا تھا نہ گیا۔ بہرکیف اسے بھی میں ضیاء الحق صاحب کے احسانات میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ایوارڈ کے لائق سمجھا۔

ان کا ایک بہت بڑا احسان مجھ پر بالواسطہ ہوا' جس کا ذکر بارہا میں اپنے قریبی رفقاء کی محفلوں میں کر چکا ہوں کہ سیرت مطہرہ کے از سرِ نو مطالعے اور فلسفۂ سیرت کو گہرائی میں سمجھنے کی تحریک میرے اندر اُن سیرت کانفرنسوں کی وجہ سے ہوئی جن کا اجراء صدر صاحب نے اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں کیا تھا۔ چونکہ تمام سرکاری محکموں کو حکومت کی جانب سے سیرت کے جلسوں کے انعقاد کی خصوصی ہدایات دی گئی تھیں لہٰذا ہر محکمہ سیرت کے جلسے کا اہتمام کرنے کا پابند تھا۔ اور اُن دنوں چونکہ شاید اس وجہ سے کہ " الھدٰی " پروگرام کے حوالے سے میرا تعارف وسیع حلقوں میں پھیل گیا تھا' ان جلسوں میں تقاریر کے لئے ہر جانب سے تقاضے آتے تھے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے بغور مطالعے کی تحریک میرے اندر انہی تقاریر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس سے قبل میرا اصل موضوع صرف قرآن تھا' حدیث سے ربط و تعلق بھی واجبی نوعیت کا تھا اور سیرت کا مطالعہ بھی گہرا نہ تھا..... لیکن اب چونکہ مجھے سیرت کے موضوع پر بار بار خطابات کا موقع ملا اور تقاریر کے معاملے میں چونکہ ہمیشہ میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ بعد کی تقریر میں پہلی تقریر سے زائد مواد سامعین کے سامنے لاؤں تو لامحالہ مجھے مختلف زاویوں سے سیرت کے مطالعے اور اس پر غور و فکر کا موقع ملا اور اس حوالے سے دین کے فلسفہ و حکمت کی کئی نئی راہیں میرے افقِ ذہنی و فکری پر وا ہوئیں۔ چنانچہ میری

تحریک اور مشن کے اعتبار سے سب سے اہم اور قیمتی چیز جو مجھے اس ذریعے سے حاصل ہوئی وہ یہ کہ انقلابی جدوجہد کے مختلف مراحل اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا گہرا شعور بحمداللہ انہی تقاریر کے ذریعے سے مجھے حاصل ہوا۔ میرے نزدیک اسلامی انقلابی عمل کے فہم میں اصل رہنمائی سیرت کے مطالعے ہی سے ملتی ہے۔ ہاں سیرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی ہو تو نور علیٰ نور! مختصراً یہ کہ اسے بھی میں صدر ضیاء الحق کے احسانات میں شمار کرتا ہوں کہ مجھے سیرت پر تقاریر کے جو مواقع ملے' بالواسطہ طور پر صدر صاحب ہی اس کا باعث بنے۔

یہاں تک تو صدر صاحب کے بلاواسطہ اور بالواسطہ احسانات کا تذکرہ تھا اور اگرچہ دنیا کے عام دستور کے مطابق تو میری جانب سے بھی جواباً صدر صاحب کی بھرپور تائید و حمایت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن الحمدللہ میرا مزاج یہ ہے کہ میں اپنی رائے پر حتی الامکان کسی چیز کو اثرانداز نہیں ہونے دیتا۔ بڑی سے بڑی عقیدت بھی بحمداللہ میری رائے اور سوچ پر اثرانداز نہیں ہوتی اور میں صرف اپنے رب اور اپنے ضمیر کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتا ہوں۔ ع "کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق"۔ چنانچہ میں نے ان کی پالیسیوں میں جو بات غلط محسوس کی اس سے اختلاف کیا اور اس اختلاف کو پوری شدت سے بیان کیا۔

گفتگو کے اختتام سے قبل میں اُس ذاتی شکایت کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جس کا حوالہ میں نے گفتگو کے آغاز میں دیا تھا۔ اس شکایت کا تعلق اسی مسجد یعنی مسجد دارالسلام سے ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ ۸۲ء میں ایک بار صدر صاحب کو اس مسجد میں جمعہ ادا کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلے سے اعلان بھی کیا گیا اور بھرپور حفاظتی انتظامات بھی۔ خطبے میں ان کے سامنے میں نے دو باتیں رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ آپ کے دور میں پہلی بار خواتین کی ہاکی ٹیم ملک سے باہر جا رہی ہے۔ آپ نے چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے اعلان کے ساتھ عنانِ حکومت سنبھالی تھی اور انتہائی افسوسناک بات ہے کہ آپ کے دور میں اس جسارت کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ صدر صاحب نے میرے مشورے کو درخورِ اعتناء سمجھتے ہوئے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ خواتین کی ہاکی ٹیم غیر ملکی دورے پر نہیں جائے گی۔

دوسری بات میں نے کرکٹ کے کھیل کے بارے میں عرض کی تھی کہ اس کھیل کی وجہ سے جمعے کا تقدس بری طرح پامال ہو رہا ہے۔ یوں بھی ہمارا ملک اس شاہانہ کھیل کا متحمل نہیں

(باقی صفحہ اگلے پر)

امیر تنظیمِ اسلامی کے

بعض ذاتی اور خاندانی کوائف

اُن کے اپنے قلم سے!

(قسطِ سوم)

لندن میں میرا قیام وسط دسمبر ۱۹۷۰ء سے وسط جنوری ۱۹۷۱ء تک تقریباً پورے ایک ماہ رہا۔ یہ میرا "عالم مغرب" سے پہلا "بالمشافہ" تعارف تھا' اس لئے کہ اس وقت تک میں بیرون پاکستان صرف ایک بار ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے سلسلے میں گیا تھا (جس میں مجھے بحمداللہ والد صاحب مرحوم اور والدہ صاحبہ مکرمہ دونوں کی معیت کی سعادت حاصل تھی!) اور اب دوسری بار بھی لندن کے اس سفر سے قبل تک "ملّا کی دوڑ مسجد تک!" کے مصداق میری کل تگ و تاز صرف سرزمین مقدس تک محدود رہی تھی..... علاوہ ازیں پاکستان سے روانگی کے وقت تک سفر یورپ کا ارادہ تو کجا گمان تک نہ تھا۔ لہٰذا اب جو اچانک "یورپ یاترا" کی صورت پیدا ہوئی تو بے اختیار حضرت اکبر کا یہ شعر ذہن میں گردش کرنے لگا کہ ؎

سدھاریں شیخ کعبے کو' ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا' ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اگرچہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ نہ صرف یہ کہ یہ دونوں کام ایک ہی سفر میں ہو رہے تھے' بلکہ مزید یہ کہ انگلستان کی VISIT حجاز مقدس کی دو VISITS کے درمیان آ رہی تھی' اس لئے کہ ایک ماہ بعد ہی مجھے حج بیت اللہ کے لئے دوبارہ حجاز آنا تھا' لہٰذا دل کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ اگر دیار مغرب میں غیر ارادی طور پر قلب و نظر کی کچھ آلودگی ہو بھی گئی تو واپسی پر عمرہ اور حج کے ذریعے تصفیہ اور تزکیہ ہو جائے گا۔

سب جانتے ہیں کہ دسمبر اور جنوری کے دوران پورے یورپ میں شدید ترین سردی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا کسی قدر خوف مجھ پر بھی طاری تھا' لہٰذا میں نے مدینہ منورہ سے ایک نہایت بھاری بھرکم اور طویل و عریض اوور کوٹ خرید لیا تھا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے لندن میں پورے ایک ماہ کے قیام کے دوران سردی کی وجہ سے کسی تکلیف کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ حالانکہ پاکستان میں میں سردی کے موسم میں بالعموم زکام اور نزلے کا شکار رہتا ہوں' جس میں ناک کی بندش اور مسلسل ریزش پر مستزاد مسلسل چھینکوں کے دَوروں سے طبیعت بہت پریشان رہتی ہے۔ لیکن وہاں اس کے باوجود کہ وقفہ وقفہ سے برف باری بھی ہوتی رہی مجھے پورے ایک ماہ کے دوران ایک چھینک بھی نہیں آئی۔ اور نہ صرف یہ کہ جہاں بھی جانا ہوتا تھا وہاں "ٹھنڈا یا گرم؟" کے جواب میں ہمیشہ آئس کریم طلب کرتا تھا' بلکہ ہائیڈ پارک میں چہل قدمی کے دوران بسا اوقات درختوں کی شاخوں پر جمی ہوئی برف بھی اتار اتار کر کھاتا رہتا تھا..... معلوم ہوا کہ میرے لئے خشک سردی نقصان دہ ہے جبکہ مرطوب سردی میرے مزاج سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔

لندن میں برادر عزیز ابصار احمد کا قیام لندن یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل "للین پنسن ہال" میں تھا' جو نہایت آرام دہ اور ہر طرح سے آراستہ اور پیراستہ تھا۔ دراصل یہ اس سے قبل ایک اعلیٰ درجہ کا ہوٹل تھا (لازماً فائیو سٹار رہا ہوگا) اور اسی سے برطانیہ کے اس وقت کے وزیر جنگ لارڈ پروفومو اور ایک سوسائٹی گرل کرسٹائن کیلر کا بدنام زمانہ سکینڈل متعلق تھا (جس کی وجہ سے لارڈ پروفومو کو وزارت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے) اور غالباً اسی بدنامی کے باعث ہوٹل بند ہو گیا تھا اور اس عمارت کو لندن یونیورسٹی نے طلبہ کی رہائش کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ بہرحال اس ہاسٹل میں ہر طرح کا آرام میسر تھا' ہر کمرے کے ساتھ جدید ترین آسائشوں سے مرصّع نہایت صاف ستھرا غسل خانہ منسلک تھا اور سنٹرل HEATING کے ذریعے ٹمپریچر ایسا رکھا جاتا تھا کہ رات کو بھی محض رسماً ایک چادر اوڑھنے کی نوبت آتی تھی' اور گرم کپڑے صرف باہر نکلتے ہوئے ہی پہننے پڑتے تھے۔

للین پنسن ہال' لندن کے عین قلب میں پیڈنگٹن (PADDINGTON) ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل اور ہائیڈ پارک سے چہل قدمی کے فاصلے پر واقع تھا۔ لہٰذا

لندن کے جملہ مرکزی مقامات کی سیر تو پیدل ہی ہو گئی۔ اسی زمانے میں اندازہ ہوا ہم تمام بھائیوں میں سب سے بڑے یعنی اظہار احمد صاحب اور سب سے چھوٹے یعنی ابصار احمد کے مزاج میں بعض دوسری مشابہتوں کے علاوہ ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں پیدل چلنے کا خصوصی شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ بھائی جان جن دنوں میکلیگن انجینئرنگ کالج لاہور (جواب یونیورسٹی بن چکی ہے) میں زیر تعلیم تھے تو سردیوں کے موسم میں ان کا ایک پسندیدہ مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ اتوار کو علی الصبح باغبانپورہ سے جی ٹی روڈ پر پیدل چلتے ہوئے امرتسر پہنچ جاتے تھے اور شام تک واپس بس کے ذریعے آجاتے تھے۔ اسی قدر میں نے ان دنوں عزیزم ابصار احمد کو پیدل چلنے میں انتھک پایا۔ نتیجتاً مجھے بھی ان ایام میں بہت پیدل چلنا پڑا اور جہاں تک یاد پڑتا ہے خود مجھ پر بھی کم از کم اس وقت یہ شاق نہیں گذرا تھا۔

لندن سے باہر بھی متعدد مقامات پر ریل یا کار کے ذریعے جانا ہوا۔ ان میں سے ایک ایک سفر آکسفورڈ، ریڈنگ (جہاں کی یونیورسٹی سے عزیزم ابصار احمد نے ایم فل کیا تھا) اور ونڈسر (جہاں کا شاہی قلعہ پوری دنیا میں مشہور ہے) کا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے مزید سیاحتی نوعیت کے اسفار کی یاد اب دھندلا گئی ہے۔ البتہ ایک اور سفر کی یاد حافظے میں پوری طرح برقرار ہے، جس کی نوعیت بالکل جدا تھی۔ یہ سفر میں نے برمنگھم کا کیا تھا اور اس کا مقصد اسلامی جمعیت طلبہ کے دور کے ایک ہم عصر ساتھی پروفیسر خورشید احمد صاحب سے ملاقات کی تجدید تھا۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں جمعیت کے ہم دونوں سے سینئر ناظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد نسیم صاحب کی قیام گاہ پر تقریباً چوبیس گھنٹے مسلسل ایک ہی کمرے میں مقیم رہے تھے۔ (اس لئے کہ نمازیں بھی ہم نے وہیں ادا کی تھیں!)

اس سیر و تفریح کا میری صحت پر بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔ اور بحمداللہ طبیعت کا وہ اضمحلال بہت حد تک رفع ہو گیا جو پورے ایک سال کے مسلسل شام کے بخار پھر مدینہ منورہ کے رمضان مبارک کی شدید مشقت و ریاضت، اور ان سب پر مستزاد رمضان کے بعد کے دو ہفتوں کے دوران اسی "پس چہ باید کرد" کی نوعیت کے سوچ بچار سے پیدا ہوا تھا، جس کا مفصل ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے اور جس کے زیر اثر لندن روانہ ہونے سے ایک دن قبل جدہ میں مجھ پر یادداشت کے عارضی طور پر ماؤف ہونے کا حملہ ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ

میری اس اچانک "لندن یاترا" میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت اور میرے لئے اہم مصلحت مضمر تھی

لندن کے اس سفر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری عظیم تر حکمت و مصلحت کا احساس وادراک بھی مجھے جلد ہی ہو گیا۔

جہاں تک مغربی فکر اور فلسفے کا تعلق ہے اس سے تو بحمد اللہ مجھ میں کوئی مرعوبیت سرے سے موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ اول تو میں بالکل بچپن ہی سے علامہ اقبال کا کلام انتہائی ذوق و شوق سے پڑھتا رہا تھا جنہوں نے اپنے بارے میں بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف!

پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے اصحاب قلم کی تحریروں کے ذریعے مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کی بے راہ روی کا بھرپور اندازہ ہو گیا تھا۔ مزید برآں چند ہی سال قبل علامہ اقبال کے "خطبات" کے گہرے مطالعے سے بحمد اللہ ایمان باللہ اور توحید کے ضمن میں "رسوخ علمی" وقت کے اعلیٰ ترین فلسفہ و حکمت کی سطح پر بھی حاصل ہو چکا تھا' (اس کی تقریب یوں ہوئی تھی کہ جب عزیزم ابصار احمد کراچی یونیورسٹی میں ایم اے فلسفہ کر رہے تھے تو انہوں نے "خطبات اقبال" کے فہم کے سلسلے میں مجھ سے مدد طلب کی تھی۔ میں نے اس سے قبل ایک دو بار خطبات کا مطالعہ کرنا چاہا بھی تھا تو پہلے ہی خطبے میں وارد شدہ بھاری بھر کم فلسفیانہ اصطلاحات سے شکست مان کر کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑی تھی اور آگے بڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ لیکن اب جب چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے "حسن ظن" کی بنا پر مدد چاہی تو طبیعت نے ایک چیلنج سا محسوس کیا' چنانچہ جیسے بھی بن پڑا خطبات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس طرح اپنی "علمیت" کا بھرم قائم رکھا۔)

لہٰذا فکر کی حد تک تو میں مطمئن تھا البتہ میرے تحت الشعور میں یہ اندیشہ ضرور موجود تھا کہ کہیں مغرب کی سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی سے قلب و ذہن زیادہ اثر نہ لے لیں۔ لیکن الحمد للہ کہ عملاً صورت بالکل برعکس رہی۔ چنانچہ مجھے لندن کی تعمیرات میں سے بھی صرف ایک چیز

نے متأثر کیا' یعنی اس کی زیر زمین ریل (TUBE) کے نظام نے اور انگریزی تہذیب کی بھی بس ایک ہی بات بھلی لگی اور وہ تھی انگریزوں کی کم گوئی اور خاموشی پسندی..... اس کے علاوہ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ یہاں بھی عام انسان ہی بستے ہیں' جن کے مسائل و معاملات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کسی دوسری جگہ کے انسانوں کے' چنانچہ برادرم ابصار احمد کے دوست اور ملنے جلنے والے جب بھی مجھ سے دریافت کرتے کہ " آپ نے یہاں آکر خاص بات کیا محسوس کی؟ " تو میرا جواب یہی ہوتا تھا کہ "اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہاں کی انسانی مادہ کی ٹانگیں ننگی ہوتی ہیں! " (یہ غنیمت ہے کہ ان دنوں شدید سردی کے باعث اوپر کا تن اکثر و بیشتر لباس میں ڈھکا ہوا نظر آتا تھا ورنہ اگر موسم گرمی کا ہوتا تو لازماً معاملہ مزید دگرگوں ہوتا) اور اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بحمداللہ میں نے مغربی تہذیب سے شدید نفرت اور حقارت کے جذبات اپنے اندر محسوس کئے اور انسانی حریت اور معاشی انصاف کے میدانوں میں یورپ نے تمدنی ارتقاء کے جو مراحل شدید محنت و مشقت سے طے کئے ہیں وہ سب میری نظر میں نہایت حقیر اور بے وقعت ہو کر رہ گئے جب میں نے وہاں اپنی آنکھوں سے صنفِ نازک اور انسانیت کے "نصف بہتر" کی توہین و تذلیل کی صورت میں شرف انسانیت کو پامال ہوتے دیکھا!..... میں نے محسوس کیا کہ وہ جنس لطیف جو مشرق میں آج بھی "جنس گراں مایہ" کا درجہ رکھتی ہے مغرب میں ایسی "جنس ارزاں" بن گئی ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ محض ایک کھلونے اور دل بہلانے کے ذریعے کی حیثیت اختیار کرلی ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی مرد کی شان استغنا بے حسی کی حدوں کو چھو رہی ہے اور بے چاری عورت اس کے لئے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بننے کے لئے لباس کی تہمت سے کُلّیتہً بری ہونے کے لئے بے تاب ہے!..... اس سے جہاں عورت پر ترس آیا اور مغربی تہذیب سے شدید نفرت پیدا ہوئی وہاں دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے لئے شکر و حمد کے جذبات بھی ابھرے کہ اس نے ہمیں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا فرما کہ کتنا عظیم احسان فرمایا ہے اور کیسی کیسی پستیوں اور گندگیوں سے بچالیا ہے!..... اور تب مجھے محسوس ہوا کہ کیوں علامہ اقبال نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اسلام کے نظام اجتماعی کی برکتوں کے ضمن میں حریت انسانی' اور عدل اقتصادی دونوں پر انسانیت کے نصف بہتر کے ناموس کی حفاظت کو مقدم رکھا ہے اور

ابلیس لعین کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکار شرع پیغمبرؐ کہیں!
الحذر! آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن' مرد آزما' مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں!

اس کے ساتھ ہی دل میں اس عظیم اور نازک ذمہ داری کا احساس شدت کے ساتھ ابھرا جو شرع و آئین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حامل و امین امت پر عائد ہوتا ہے۔ کہ دنیا کو اس قعر مذلت سے بچانے کی ذمہ داری ہم پر تھی..... کہ ہم شرع و آئین پیغمبر' علیہ الصلوۃ والسلام کی علمی اور عملی شہادت دیتے' اور بقول علامہ اقبال۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے!

کے مصداق بنتے' جبکہ فی الواقع ہمارا حال یہ ہے کہ پوری امت مسلمہ بالعموم اور اس کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی عظیم اکثریت بالخصوص خود "محروم یقین" ہے۔

اس سلسلے میں میرا ذہن خود اپنے ذاتی مسئلے کی جانب بھی منتقل ہوا کہ کیا اندریں حالات ایک ایسے شخص کے لئے جسے خود بھی اسی جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوصف اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے "یقین" کا کچھ سرمایہ اور "شرع و آئین پیغمبرؐ" پر

ذہنی و قلبی اعتماد کی دولت عطا فرمادی ہو' اور اس سے بھی اہم تر یہ کہ اپنے کلام پاک اور "نوع انساں را پیام آخریں" کے ساتھ قلبی و ذہنی مناسبت بھی عطا فرمادی ہو' اور اس کے بیان و اظہار کے لئے زبان کی گرہ کو بھی کھول دیا ہو' جائز ہے کہ وہ اپنی بہتر اور بیشتر مساعی کو محض اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاش کے لئے وقف کر دے؟..... اور اس طرح' الحمدللہ کہ' انگلستان کی مخالفِ دین و مذہب فضا نے میرے حق میں "تندئ باد مخالف" کا روایتی رول ادا کیا۔ اور قیام لندن کے دوران جیسے جیسے وقت گذرا میری طبیعت کا غالب رجحان اس جانب بڑھتا چلا گیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ معاش کے معاملے کو بالکلیّہ اللہ کے حوالے اور اس کے وعدے "و یرزقه من حیث لایحتسب" پر "اندھا" اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت و حکمت قرآنی کی نشر و اشاعت اور احیاء اسلام اور غلبہ دین کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا جائے!

مغرب کی خلافِ دین و مذہب فضائے دین و مذہب کے حق میں ردعمل کا ایک اور عمومی مشاہدہ بھی مجھے لندن کے قیام کے دوران ہوا۔

لندن میں جمعہ کی نماز کے لئے اہم ترین جگہ تو ریجنٹ پارک کی مسجد تھی (جو اس وقت تک تو صرف ایک وسیع کوٹھی کی شکل میں تھی' اب ماشاءاللہ عظیم الشان مسجد اور اہم "اسلامک کلچرل سنٹر" کی صورت اختیار کر چکی ہے) لیکن اس کا فاصلہ ہماری جائے قیام سے بہت زیادہ تھا۔ ہمارے لئے قریب ترین مقام پاکستانی سفارتخانے کے قریب واقع "پاکستان اسٹوڈنٹس ہاسٹل" تھا جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی۔ وہاں میں نے ایک عجیب معمول دیکھا کہ جمعے کی نماز کے بعد بیس پچیس کے قریب اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان (بعض ڈاکٹریٹ کے لئے کوشاں اور اکثر ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے حصول کے بعد کسی دوسری یونیورسٹی سے "توثیق مزید" کی سعی میں مشغول) جن کی اکثریت اعلیٰ مغربی لباس میں ملبوس اور جن کے چہرے داڑھی سے مبرا ہوتے تھے' ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ کر قرآن مجید کے ایک رکوع کا مطالعہ اس طور سے کرتے تھے کہ پہلے ہر شخص اس رکوع کی تلاوت کرتا تھا تاکہ وہ خود بھی دوسروں سے سن کر اپنی تلاوت کی تصحیح کر سکے اور اگر پھر بھی اس کی تلاوت میں کوئی

غلطی رہ جائے تو دوسرے اس کی تصحیح کر دیں۔ پھر چند شرکاء جو اس رکوع کا مطالعہ مختلف تفسیروں سے کر کے آئے ہوتے تھے اپنا اپنا حاصل مطالعہ بیان کرتے..... اور اس طرح اس رکوع کے مضامین جملہ شرکاء محفل کے ذہنوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو جاتے تھے۔

میں نے دل میں سوچا کہ پورے پاکستان میں اس معیار اور اس مزاج کے نوگوں کی کسی ایسی ہفتہ وار نشست کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' پھر یہاں اس کے انعقاد کا سبب کیا ہے؟ بہت غور و فکر کے بعد اس کی جو توجیہ میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ دیار مغرب میں حصول تعلیم یا تلاش معاش کے لئے آنے والے نوجوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے نہ تو اپنے ذہن و فکر میں مذہب و اخلاق کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں' نہ ہی ان کے خاندانی پس منظر میں گہری اور مضبوط مذہبی روایات موجود ہوتی ہیں' ایسے لوگوں کی اکثریت تو انگریزی زبان کے محاورے " DOWN THE DRAIN " کے مصداق مغربی تہذیب کے بدرو میں خس و خاشاک کے مانند بہہ جاتے ہیں' لیکن دوسری قسم کے نوجوان جن کے اپنے ذہن و قلب میں مذہب کی جڑیں گہری ہوتی ہیں یا کم از کم ان کی خاندانی روایات اور تہذیبی پس منظر میں دین و مذہب کو اہم مقام حاصل ہوتا ہے ان کی دینی غیرت و حمیت خواہ اپنے ملک میں کسی سبب سے خوابیدہ ہی رہی ہو یہاں کے مخالفانہ ماحول میں راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ ان میں اپنے مذہبی و تہذیبی تشخص کا احساس شدت سے جاگ جاتا ہے اور وہ اس کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں..... اور یہ گویا وہی چیز ہے جسے عرف عام میں "اقلیتی ردعمل" (MINORITY REACTION) کہا جاتا ہے..... بعد میں اس کیفیت (PHENOMENON) کا مشاہدہ مجھے نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ امریکہ میں بھی ہوا۔

بہرحال' میں جس ادھیڑبن میں کچھ عرصے سے مبتلا تھا' اس کے معاملے میں ایک جانب فیصلہ کن رجحان کے پیدا ہونے میں' یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس "ردعمل" کو بھی کچھ دخل حاصل تھا۔ اگرچہ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سب مشیت ایزدی کا مظہر اور فضل خداوندی کا ثمرہ تھا کہ اس نے مجھے دین و مذہب کے اعتبار سے ایک مخالفانہ اور متضاد فضا میں بھیج کر میرے تحریکی و اساسی کی تربیت اور میری قوت ارادی اور خود اعتمادی کی تقویت کا

سامان فراہم کیا تھا۔ اس لئے کہ میں تو گھر سے انگلستان کا قصد کر کے نکلا ہی نہیں تھا' گویا میرا سفر لندن نہ معروف معنی میں اختیاری و ارادی تھا' نہ خالص اتفاقی..... بلکہ فی الحقیقت اس میں "ثم جئت علی قدر یا موسیٰ" کا ادنیٰ عکس موجود تھا! اس لئے کہ ہمارے نزدیک تو "فاعل حقیقی" سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی ہے ہی نہیں! (بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ "لافاعل فی الحقیقت ولا مؤثر الا اللہ!")

قیام لندن کے دوران ایک اور واقعہ بھی قارئین کی دلچسپی کا موجب ہو گا۔ ایک روز ہم دونوں بھائی اس مرکز کے ارادے سے نکلے جو جماعت اسلامی کے حلقے کے لوگوں نے تازہ تازہ قائم کیا تھا اور جہاں سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک انگریزی جریدے "IMPACT" کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ مجھے خیال تھا کہ شاید وہاں جمعیت یا جماعت کے پرانے ساتھیوں میں سے کسی سے ملاقات ہو جائے۔ ہمارے پاس اس جگہ کا ایڈریس تو تھا لیکن عزیزم ابصار احمد کے لئے بھی وہ علاقہ نیا تھا۔ لہٰذا ہمیں اس جگہ کی تلاش میں دقت ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں ہمیں اچانک وہاں ایک ہندوستانی پاکستانی وضع قطع کے شخص نظر آئے تو ہم نے ان سے رجوع کیا۔ انہوں نے ہم دونوں کو غور سے دیکھنے کے بعد ذرا توقف کیا' اور پھر کہا "میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آ جایئے!"..... چنانچہ ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ جتنی دیر ہم وہاں رہے وہ بھی خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو انہوں نے آہستگی سے دریافت کیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ وہ جمعہ کا دن تھا اور ہمیں نماز جمعہ کے لئے پاکستان ہاسٹل جانا تھا۔ جب ہم نے انہیں اپنا ارادہ بتایا تو انہوں نے کہا "کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" ظاہر ہے کہ ہمارا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ "بسر و چشم!" چنانچہ وہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان ہاسٹل گئے۔ وہاں جمعہ بھی اس روز مجھے ہی پڑھانا تھا جس میں وہ بھی شریک رہے' پھر "مطالعۂ قرآن" کی معمول کی نشست کے بجائے بھی میرا ہی درس قرآن رکھا گیا تھا چنانچہ اس میں بھی انہوں نے شرکت کی' اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا تو اس میں بھی وہ ہمارے ساتھی کی حیثیت سے شریک رہے۔ بعد ازاں جب شام کے قریب ہم وہاں سے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے دوبارہ اسی آہستگی اور شائستگی

کے ساتھ کہا " آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا اگر میں بھی آپ کے ساتھ آپ کی قیام گاہ پر چلوں ! " ..... اب ہمیں بجا طور پر کسی قدر حیرت تو ہوئی تاہم تہذیب کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم کہتے " ضرور چلئے ! " ..... چنانچہ وہ ہمارے ساتھ ہی للین پنسن ہال آ گئے ' اور وہاں کسی قدر توقف اور کچھ روایتی خورد و نوش کے بعد انہوں نے اپنا راز کھولا کہ " میرا نام غیاث ہے ' میرا تعلق سکھر سے ہے ' وہاں میں جمعیت کا کارکن تھا ' اور آپ سے غائبانہ متعارف بھی تھا اور دلی محبت بھی کرتا تھا ' مجھے جب معلوم ہوا کہ آپ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے ہیں تو مجھے تعجب بھی بہت ہوا تھا اور رنج بھی ' آج کل میں مانچسٹر میں مقیم ہوں اور وہیں سے میں نے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کیا ہے ' کل ہی مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ آپ ان دنوں لندن آئے ہوئے ہیں ' لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کا قیام کہاں ہے۔ میں مانچسٹر سے صرف آپ کی ملاقات کے لئے آیا ہوں اور " IMPACT " کے دفتر اس امید میں جا رہا تھا کہ شاید وہاں کسی سے آپ کا پتہ مل سکے ' کہ اچانک آپ نے خود ہی رہنمائی کے لئے مجھ سے رجوع کر لیا اور اس طرح میری مشکل آسان ہو گئی۔ میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے اسباب کیا ہیں ؟ "

حسن اتفاق سے اس وقت میرے بریف کیس میں " تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ " کا ایک نسخہ موجود تھا جو میں نے انہیں دے دیا۔ جس پر انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد پورے تین دن تک ہمیں ان کی کوئی خبر نہ ملی جس پر ابتدا میں تو کچھ تشویش سی رہی لیکن پھر ہم بھی کچھ بھول سے گئے تھے کہ اچانک چوتھے دن وہ تشریف لے آئے۔ اس حال میں کہ نہایت مضمحل اور نڈھال تھے اور انتہائی اداسی اور افسردگی ان پر طاری تھی ..... آتے ہی کہنے لگے " میں ان تین دنوں کے دوران بالکل پاگل پن کی کیفیت سے دوچار رہا ہوں[1] میں نے آپ کی کتاب جاتے ہی ایک نشست میں پڑھ ڈالی تھی اور اس کا فوری ردعمل مجھ پر یہ ہوا تھا کہ میں نے کتاب کو تو زور کے ساتھ دیوار پر دے مارا تھا اور بے اختیار یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے تھے کہ " مجھے

---

[1] I have been mad all these day

دھوکہ دیا گیا ہے![1]..... آج بھی میں بمشکل ہی اپنے آپ کو اس قدر سنبھال سکا ہوں کہ آپ کی کتاب واپس کرنے آگیا ہوں!"۔

میں نے جواباً کتاب تو ان ہی کے پاس رہنے دی اور انہیں سمجھایا کہ "مجھے یا آپ کو کسی نے جان بوجھ کر دھوکہ نہیں دیا' تحریکوں اور جماعتوں سے نیک نیتی کے ساتھ بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور باہمت لوگوں کا فرض ہے کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے آئندہ کے لئے صحیح لائحہ عمل اختیار کر لیں اور اگر مقصد پر یقین اور اعتماد برقرار رہے تو از سر نو کمر ہمت کو کس کر ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" کے سے انداز میں پھر رخت سفر باندھ لیں۔ مجھے اصل تشویش اس بات کی ہے کہ ایک جانب تو جماعت اسلامی کی قیادت لگ بھگ ربع صدی کے تجربات کے باوجود بھی اپنے طریق کار پر نظر ثانی پر آمادہ نہیں ہو رہی' اور دوسری جانب جو لوگ طریق کار سے اختلاف کے باعث جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے ان کی اکثریت تعطل کا شکار ہو کر مقصد اور نصب العین ہی کے بارے میں مذبذب اور متردّد ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اندریں حالات جن لوگوں پر موجودہ طریق کار کی غلطی واضح ہو جائے لیکن اصل نصب العین کے ساتھ وابستگی برقرار رہے ان کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے! اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں دعوت دی کہ واپس پاکستان تشریف لے آئیں اور تحریک کے رخ کو صحیح سمت میں موڑنے کی جو کوشش بھی کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کریں۔ انہوں نے اس وقت تو میرے مشورے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ دیار مغرب میں جا ڈیرہ لگانے والوں کی اکثریت وہاں ایسی بے بس سی ہو جاتی ہے کہ پھر لاکھ خواہش کے باوجود مراجعت وطن تقریباً ناممکن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تو ان سے رابطہ رہا اور انہوں نے اپنا ایک مقالہ بھی عالم اسلام کی احیائی تحریکوں کے جائزے پر مشتمل مجھے ارسال کیا تھا جس میں میری کتاب سے بڑے مفصل اقتباسات درج کئے تھے..... لیکن پھر رابطہ ٹوٹ گیا..... اور ایک طویل عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی انقلابی مذہبیت یا مذہبی انقلابیت نے شکیل بدایونی کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

تو اگر برا نہ مانے' تو جہان رنگ و میں
میں سکون دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

---

[1] I have been cheated

ایرانی انقلاب کی تائید اور وکالت کے ذریعے تسکین کی صورت پیدا کر لی۔ چنانچہ آج کل وہ ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے قائم کردہ "مسلم انسٹیٹیوٹ لندن" میں ڈاکٹر صاحب کے دست راست کے طور پر والہانہ اور ہمہ تن و ہمہ وقت انداز میں کام کر رہے ہیں... کاش اب بھی وہ پاکستان واپس آ کر اپنے ملک میں اسلامی انقلاب کے بنیادی تقاضوں (PRE-REQUISITES) کو پورا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز!

اپنی اس پہلی اور طویل ترین لندن "یاترا" کے ذکر کے اختتام سے قبل، زیادتی ہو گی اگر اس حقیقت کا اظہار نہ کروں کہ اس ایک ماہ کے عرصے کے دوران عزیزم ابصار احمد نے میری خدمت اور خاطر تواضع کا بھرپور حق ادا کیا اور ایک طالب علم کی حیثیت سے جو رقم ماہانہ اخراجات کے لئے انہیں برادرم اقتدار احمد کی جانب سے ملتی تھی اس میں سے انہوں نے جو کچھ پس انداز کیا ہوا تھا اس میں سے دل کھول کر خرچ کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

وسط جنوری ۱۹۷۱ء میں لندن سے جدہ واپس جاتے ہوئے میں نے دو دن بلجیم کے دارالحکومت برسلز میں قیام کیا۔

اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حجاز مقدس میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے ایک رشتے کے پھوپھا، سید منظور حسنؒ عرصہ دراز سے مقیم تھے۔ ان کا اپنا مکان تو مکہ مکرمہ میں تھا لیکن ان کے صاحبزادے جدہ میں مقیم تھے۔ اور وہ خود بھی موسم حج میں اپنا مکہ والا مکان حجاج کرام کو کرائے پر دے کر جدہ چلے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے موقع پر میں نے بھی اپنے والدین اور منٹگمری (ساہیوال) کے بعض دوسرے رفقاء کے ساتھ ان ہی کے مکان میں قیام کیا تھا... شاہ صاحب حد درجہ نیک دل اور دین دار مسلمان تھے، اور چونکہ سعودی عرب کے مخصوص ماحول میں ان کی نیکی اور جذبہ تبلیغ و خدمت دین کو کوئی اور لائحہ عمل دستیاب نہیں تھا لہٰذا انہوں نے ایک خاص کام اپنے ذمے لے لیا تھا اور وہ یہ کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں سے بھی انہیں کسی غیر مسلم کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع ملتی تھی، اس سے رابطہ قائم کر کے اس کی مشکلات اور مسائل معلوم کرتے تھے اور پھر حتی الامکان انہیں حل

کرنے کی کوشش کرتے تھے..... اس بار لندن روانگی سے قبل جب ان سے جدہ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے برسلز کے ایک نوجوان کا ایڈریس مجھے دیا اور خواہش ظاہر کی کہ میں اس سفر میں کسی طرح دو دن نکال کر وہاں جاؤں اور اس نوجوان سے ملاقات کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے قیام لندن کے دوران اس نوجوان سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ شادی کے خواہشمند ہیں تو اس سلسلے میں برادرم ابصار احمد کے ملنے جلنے والوں میں ایک نہایت شریف اور نیک ترک مسلمان سے ان کی دختر کے بارے میں بات بھی کی تھی' جو لندن میں درزی کا کام کرتے تھے۔ اور اب میں ان سے ملاقات کے لئے برسلز حاضر ہوا تھا۔

ان کی ہدایت پر میں نے برسلز کے ایک ہوٹل میں قیام کر لیا تھا۔ جہاں وہ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد آ گئے۔ ان سے جو حالات معلوم ہوئے وہ میرے لئے نہایت سبق آموز بھی تھے اور غیرت و حمیت دینی کی تقویت کا باعث بھی!

ان کا والدین کا رکھا ہوا نام وان کنٹر (VONCANTER) تھا' اور ان کے والدین راسخ العقیدہ رومن کیتھولک تھے جن کی وہ واحد "اولاد" تھے۔ ایک بار وہ سیر و سیاحت کی غرض سے مراکش گئے تو وہاں کا معاشرہ انہیں اتنا پسند آیا کہ وہیں ایک سکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ اور بالآخر وہیں مشرف بہ اسلام ہو گئے اور عبدالعزیز نام اختیار کر لیا۔ واپس آئے اور والدین کے علم میں ان کا اسلام لے آنا آیا تو انہیں صدمہ تو بہت ہوا لیکن بالآخر انہوں نے باہم یہ مصالحت کر لی کہ وہ گھر میں ساتھ ہی رہیں گے اور کبھی مذہب کے معاملے میں گفتگو نہیں کریں گے۔

اس وقت ان کی عمر ۲۷' ۲۸ کے لگ بھگ تھی۔ اور سرخ و سپید چہرے پر بھورے رنگ کی داڑھی بہار دے رہی تھی۔ دین کے فلسفہ و حکمت سے تو انہیں کوئی خاص ذہنی مناسبت نہ تھی لیکن فقہی معلومات میرے مقابلے میں کم از کم دس گناہ زیادہ تھیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جب اصولی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر تمام مذاہب فقہ کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد مذہب حنبلی اختیار کیا تھا۔

میں نے ان سے بلا شائبۂ تکلف و تصنع یہ کہا کہ: "ہم جب اپنی یعنی قدیم الاسلام قوموں کی حالت کو دیکھتے ہیں تو اسلام کے مستقبل کی جانب سے مایوسی سی ہونے لگتی ہے لیکن

آپ ایسے لوگوں کو دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ اسلام میں اتنی قوت تسخیر موجود ہے کہ وہ نئے اور زندہ و بیدار لوگوں کو اپنے دامن میں کھینچ لے' اور کیا عجب کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اسی طور سے ہو!" ..... گویا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

انہوں نے مجھے برسلز کی سیر بھی خوب کرائی ..... اور ایک بار کھانے کے لئے اپنے گھر بھی مدعو کیا جہاں ان کے والدین سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے والد بلجیم کے پولیس چیف تھے' اور ان کا ایک نہایت اعلیٰ بنگلہ مضافات برسلز میں تھا وہاں مجھے دو حیرتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک یہ کہ ان کے والد اعلیٰ ترین سرکاری افسر ہونے کے باوجود انگریزی سے نابلد محض تھے (اس کا تجربہ مجھے برسلز ایئرپورٹ پر بھی ہو چکا تھا' جہاں انگریزی جاننے والا شخص صرف انکوائری آفس میں تھا) ..... اور دوسری اور کہیں زیادہ حیران کن بات یہ کہ عبدالعزیز وان کنٹر نے مجھ سے کہا کہ۔ "آپ یہاں پورے اطمینان کے ساتھ کھائیں پئیں' اس گھر میں کبھی نہ خنزیر کا گوشت آیا ہے نہ شراب کا کوئی قطرہ!" معلوم ہوا کہ رومن کیتھولک لوگوں میں ایسے باعمل عیسائی (PRACTICING CHRISTIANS) اب بھی موجود ہیں جو فرمان عیسویؑ کے مطابق شریعت موسویؑ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی پابندی کرتے ہیں۔

بہرحال برسلز کا یہ دوروزہ قیام بھی میرے لئے ایمان افروز ثابت ہوا۔ اور اس سے بھی میرے مستقبل کے عزائم کو تقویت حاصل ہوئی اور مجھے اپنے دل میں وہی جذبہ ابھرتا محسوس ہوا جسے مسلمانوں کے قلوب میں علامہ اقبال نے اپنے ان الفاظ سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ع "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!"

(اگرچہ جدہ پہنچ کر جب میں نے اپنی اس ملاقات کی مفصل رپورٹ سید منظور حسنؒ کو سنائی تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر رنج بھی پہنچا کہ انہوں نے عبدالعزیز کے مسلک حنبلی اختیار کرنے پر شدید مایوسی اور بددلی کا اظہار فرمایا ..... اس لئے کہ وہ خود مسلکاً اہل حدیث تھے اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں انتہائی نیک دل اور مخلص لوگ

بھی فروعی وفقہی اختلافات کے ضمن میں کتنے حساس اور متشدّد واقع ہوئے ہیں!)

چلتے چلتے برسلز کا ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ میں جب برسلز ایئرپورٹ سے ٹیکسی پر شہر جا رہا تھا تو ٹیکسی ڈرائیور نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے پوچھا "پاکستانی ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا، تو اس نے دوسرا سوال کیا! "اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"..... اس پر جب میں نے کہا۔ "لندن سے!" تو اس نے پلٹ کر میری جانب غور سے دیکھا اور شدید حیرانگی کے ساتھ کہا۔ "کیا کہا؟ لندن سے! میں نے آج تک لندن جانے کے خواہشمند پاکستانی ہی دیکھے ہیں۔ لندن سے آنے والے پاکستانی تو تم پہلے نظر آئے ہو!"..... میں اس وقت تو اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ لیکن جب ہوٹل میں چند پاکستانی نوجوانوں سے ملاقات ہوئی تو ان کے ذریعے ساری بات معلوم ہوئی..... دراصل برسلز غیر قانونی طور پر انگلستان میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے پاکستانیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ وہاں سے چونکہ صرف رودبار انگلستان ہی کو پار کرنا ہوتا تھا لہٰذا یہ غیر قانونی دھندا زوروں پر تھا کہ کوئی موٹر لانچ بھاری کرائے وصول کر کے رودبار کو کراس کر کے انگلستان کے ساحل پر کسی جگہ اپنا انسانی کارگو اتار کر واپس بھاگ آتی تھی۔ آگے وہ لوگ خود جانیں اور برطانیہ کی پولیس یا کوسٹ گارڈز!..... یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے سائز کے چارٹرڈ ہوائی جہاز پاکستانیوں سے لدے ہوئے جاتے ہیں اور کسی جنگ کے زمانے کی پرانی اور متروک الاستعمال ایئرسٹرپ پر لوگوں کو اتار کر واپس آجاتے ہیں!..... اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے پاکستانی "رفیق" آج کل سعودی عرب میں اپنی "کاریگری" کا جو لوہا منوا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ؎ "سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری!"

واپس سعودی عرب پہنچا تو یہ غالباً جنوری ۷۱ء کی اٹھارہ تاریخ تھی اور اتفاقاً جدہ ہی میں راؤ محمد اختر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے مدینہ منورہ کی عید الفطر کے دن والی ملاقات کے بعد پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج کی بنا پر وہ نہایت پژمردہ اور مضمحل تھے، میں نے لوہا گرم سمجھ کر کہا۔ "راؤ صاحب! کیا اب بھی آپ لوگ اپنے اندازوں اور

طریق کار پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؟"..... تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تڑخ کر جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! اب تو اگر خود مولانا مودودی بھی طریق کار کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے، تو ہم انہیں بھی ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے!"..... مجھے اس وقت تو ان کی بات ایک "جذباتی طوفان" (EMOTIONAL OUTBURST) کا مظہر نظر آئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ فی الواقع جماعت کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی تھی!۔

مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا..... تو وہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس مولانا مودودی کی اس تقریر کا ٹیپ پہنچ گیا ہے جو انہوں نے لاہور کے ایک اجتماع کارکنان میں انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی پر جماعت ہی کے حلقے کے بعض صحافیوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں کی تھی۔ (واضح رہے کہ یہ وہی صحافی تھے جو انتخابات سے قبل جماعت اسلامی کی شاندار متوقع کامیابی کے ضمن میں مبالغہ آمیز اندازے شائع کرتے رہے تھے، لیکن اب جبکہ نتیجہ برعکس نکل آیا تھا تو جماعت کی بعض حکمت عملیوں اور بالخصوص طریق تنظیم کو ہدفِ تنقید بنا رہے تھے!)۔ چنانچہ میں نے ان کے مکان پر حاضر ہو کر اس تقریر کا ریکارڈ سنا..... تو مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مولانا کسی جیوری کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہو کر صفائی پیش فرما رہے ہوں۔ چنانچہ اس پر میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے..... کہ اللہ اکبر کس قدر دردناک اور حسرتناک معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی دعوت و خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی جدوجہد میں صرف کر دی، اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ۔

ایک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند!

بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا..... اور ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے انہیں غلبہ دین کی جدوجہد کا سپاہی بنا دیا، عمر کے آخری حصے میں اپنے ہی عقیدت مندوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے..... اور اپنے بیٹوں کی عمر کے نوخیز و نومشق صحافیوں کے سامنے اپنے

بعض اساسی نظریات' بالخصوص ہیت تنظیمی کا دفاع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے..... فاعتبروا یا اولی الابصار!

بہرحال اواخر جنوری ۷۱ء کی کسی تاریخ کو مکہ مکرمہ میں زبیر عمر صدیقی صاحب کے مکان پر جو چند آنسو میری آنکھوں میں بے اختیار امنڈ آئے تھے انہوں نے میرے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا جو ۱۹۶۲ء کے بعد سے مولانا مودودی کے ساتھ کدورت کی بنا پر جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے..... کہ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرا تعلق اتار چڑھاؤ کے متعدد ادوار سے گزرا ہے' اور ان کے بارے میں میرے احساسات اور قلبی کیفیات میں کئی بار تغیر و تبدل ہوا ہے۔ چنانچہ:۔

۱۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی پندرہ سے اکیس برس عمر کے دوران ان کے ساتھ میرا تعلق غایت درجہ محبت اور احترام ہی کا نہیں' انتہائی عقیدت کا بھی تھا۔ اور میں اپنے چھوٹے سے ذہن اور محدود معلومات کی بنا پر انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد امت مسلمہ کا عظیم ترین فرد سمجھتا رہا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار ادھر لاہور اور پنجاب میں تحریک ختم نبوت کے ضمن میں جماعت اسلامی کے رول اور ادھر کراچی میں طلبہ کی کمیونسٹ تحریک کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رول سے میرے ذہن میں اولین شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں اُس اختلافی سوچ کا آغاز ہوا۔ جو ۵۶۔ ۵۵ء تک اپنے نقطہ عروج تک پہنچ گئی اور نومبر ۵۶ء میں اس اختلافی بیان کی صورت میں ضبط تحریر میں بھی آ گئی جو پورے دس سال بعد (۱۹۶۶ء میں) "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع ہوا..... اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ عقیدت کا تو خاتمہ ہو گیا' تاہم محبت اور احسان مندی کا جذبہ برقرار رہا۔

۳۔ ۵۶ء سے اپریل ۵۷ء تک مولانا مرحوم کے بعض اقدامات کی بنا پر ان کے ساتھ حسن ظن کو شدید صدمہ پہنچا..... لیکن اس کے باوجود ایک گونہ دلی تعلق بھی برقرار رہا..... اور

احسان مندی کے جذبات میں بھی کوئی کمی نہیں آئی..... اور اپریل ۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد سے اپریل ۶۲ء تک یہ کیفیت علیٰ حالہٖ برقرار رہی۔ چنانچہ ابتداء میں تو میں ملاقات کے لئے بھی حاضر ہوتا رہا اور اگرچہ یہ محسوس کر کے کہ مولانا بھی میری آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور ۵۔ اے 'ذیلدار پارک کی عمومی فضا میں تو بہت ہی ناگواری پائی جاتی ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں کے چہرے تو ہو بہو "تعرف فی وجوھھم المنکر" کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں' میں نے آمدورفت تو بند کر دی..... تاہم مولانا سے کوئی قلبی بُعد پیدا نہیں ہوا اور احسان مندی کے جذبات توجوں کے توں قائم رہے..... چنانچہ اپریل ۶۲ء میں حج کے لئے روانگی سے قبل میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ۔ "مولانا! میں حج کے لئے جارہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگرچہ جماعت کی پالیسی سے میرا اختلاف نہ صرف علیٰ حالہٖ قائم ہے بلکہ شدید تر ہو گیا ہے..... لیکن میرے دل میں آپ کی جانب سے کوئی کدورت نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری جانب سے کوئی مَیل ہو تو آپ بھی اسے صاف فرمالیں!"..... اس پر مولانا نے بڑے اطمینان اور انشراح کے ساتھ فرمایا: "آپ بالکل مطمئن رہیں' میرے دل میں آپ کی جانب سے ہرگز کوئی میل نہیں ہے!"..... یہی وجہ ہے کہ جب میری روانگی کے بعد دفعتہً مولانا کو سعودی حکومت کی جانب سے "رابطۂ عالم اسلامی" کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اور چند روز بعد وہ بھی حجاز مقدس پہنچ گئے تو میں نے ان سے متعدد بار مکہ مکرمہ میں فندق مصر میں ملاقات کی۔ پھر منیٰ میں بحالت احرام شرف ملاقات حاصل کیا۔ اور آخری بار مدینہ منورہ میں ملاقات بھی کی اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں کچھ گفتگو بھی کرنی چاہی۔ اگرچہ اس کا جواب مجھے بہت حوصلہ شکن ملا۔

۴۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک جانب جمہوریت کے عشق میں جس انتہاپسندی کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر بلکہ ملحد عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی' اور مبالغہ آرائی اس حد تک پہنچ گئی کہ صدر ایوب خاں بمقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے باب میں یہ الفاظ تک کہہ دیئے گئے کہ۔ "ایک جانب ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی

نہیں کہ وہ مرد ہے' اور دوسری جانب ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے!"..... اور دوسری طرف عوامی توجہ کا مرکز بننے کے لئے دینی اعتبار سے اس درجہ پستی اختیار کر لی گئی کہ "غلاف کعبہ کی رام لیلا" منعقد کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہ کیا..... وغیر ذالک..... تو' مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ' میرے دل میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ یہاں تک کہ احسان مندی کے جذبات بھی اس منفی جذبے کے نیچے دب کر رہ گئے..... یہی سبب ہے کہ میری ۶۶ء تا ۷۰ء کی تحریروں میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے!۔

۵۔ اور یہی وہ کیفیت تھی جس میں ایک اچانک انقلاب اواخر جنوری ۷۱ء کی اس شام کو مکہ مکرمہ میں آیا۔ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جس کے نتیجے میں نفرت کی جگہ تاسف آمیز حسرت نے لے لی' اور اگرچہ اختلاف پوری شدت کے ساتھ قائم رہا..... تاہم قلب کی گہرائیوں سے ذاتی احسان مندی کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا۔ جو بحمد اللہ آج تک برقرار ہے!۔

۶۔ لیکن اس کے بعد بھی مولانا سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی۔ اس لئے کہ ایک تو اس طویل عرصے کے دوران بہت سے اسباب کی بنا پر' اور بالخصوص میری اپنی بعض تحریروں کے باعث حجابات بہت گہرے ہو چکے تھے..... دوسرے پالیسی کا اختلاف جوں کا توں برقرار تھا..... اور یہ بات میرے علم میں بہت دیر کے بعد آئی کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی شکست کے بعد مولانا اپنی بعد از تقسیم ہند پالیسی سے مایوس ہو گئے تھے اور تہہ دل سے چاہتے تھے کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن اب کچھ اپنی ضعیفی اور علالت' اور کچھ جماعت کے کارکنوں' اور بالخصوص اس کی نئی قیادت کے مزاج میں سیاسی رنگ کے پختہ ہو جانے کے باعث وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے..... بہرحال' جب میرے علم میں یہ حقائق آئے تو فطری طور پر دل میں ملاقات کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن جن ذرائع سے مولانا کے نقطہ نظر کی تبدیلی کا علم حاصل ہوا تھا ان ہی کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے گرد جماعت کا حفاظتی حصار بہت سخت ہے' اور اول تو ان سے میری ملاقات ہی محال کی حد تک مشکل ہے' ثانیاً اس کی توقع بہت کم ہے کہ مولانا کھل کر بات کر سکیں۔ لہٰذا اس "سعیٔ لاحاصل" کا ارادہ ترک کر دیا۔

۷۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اگست میں امریکہ سے ایک زوردار دعوت موصول ہوئی اور میں نے اسے قبول کر لیا تو اس خیال کے تحت کہ مولانا بھی آج کل وہیں مقیم ہیں دل میں دبی ہوئی خواہش کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پختہ ارادہ کر لیا کہ وہاں ملاقات ضرور کروں گا..... لیکن افسوس کہ جیسے ہی میں امریکہ پہنچا' مولانا شدید علیل ہو گئے' اور شدید خواہش کے باوجود ان سے زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف ان کے مردہ جسد خاکی کی زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت نصیب ہو سکی..... اور اس موقع پر مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق کے اس جملے نے میری حسرت کو دہ چند کر دیا کہ۔ "ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہشمند تھے' لیکن ان کے معالجین کی سخت ہدایت تھی کہ ان سے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہ ملنے پائے!"

قصہ مختصر یہ کہ اس طویل داستان کا ایک باب جنوری ۸۱ء میں اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس ضمن میں مبادا کوئی یہ کہے کہ یہ سب بعد کی سخن سازی ہے' میں اپنی دو تحریریں اس قسط کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر رہا ہوں۔ ایک۔ ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق دسمبر ۸۲ء اور دوسری۔ ماخوذ از "تقدیم" کتاب "اسلام اور پاکستان" شائع شدہ جنوری ۸۳ء۔

اس کے بعد جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانگی ہوئی تو میری ذہنی کیفیات اور قلبی احساسات اُس سے بہت مختلف تھے جو اُس وقت تھے جب تین ماہ قبل اواخر اکتوبر ۷۰ء میں میں اس سفر کے پہلے عمرے کے بعد مدینہ منورہ جا رہا تھا۔

اولاً..... میری جسمانی صحت اس وقت کے مقابلے میں بہت بہتر ہو چکی تھی اور ایک سالہ علالت کے آثار تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

ثانیاً..... ذہن اس شش و پنج اور ادھیڑ بن سے تقریباً فارغ ہو چکا جو آئندہ زندگی کے بارے میں "ادھر یا ادھر" کے آخری اور حتمی فیصلے کے ضمن میں قریباً چھ ماہ سے شدت سے جاری تھی اور جس نے مجھے "قد امرضتنی و احزنتنی و اسقمتنی" کے مصداق مزید مضمحل کر دیا تھا..... چنانچہ اس معاملے میں ذہن اس پر تقریباً یکسو ہو چکا تھا کہ

مطب کو جیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت واقامت دین کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اور اس معاملے میں اب صرف ایک خلش باقی رہ گئی تھی جس کے بارے میں آخری فیصلہ میں نے حج پر ملتوی کر دیا تھا۔ (اس کا ذکر بعد میں آئے گا!)

ثالثاً ..... مولانا مودودی کے بارے میں دل کا غبار دھل جانے سے بھی طبیعت کو ایک گونہ سکون حاصل ہوا تھا۔

ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ دل پر انبساط اور انشراح کی کیفیت طاری تھی' اور جوں جوں طیبہ کا فاصلہ کم ہو رہا تھا میری طبیعت میں وہی کیفیات پیدا ہوتی جا رہی تھیں جن کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں کی ہے۔ ؎

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرشام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ!

لہٰذا مدینہ منورہ میں حضرت جامیؒ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

مشرف گرچہ شد جامیؒ زلطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کن!

دوبارہ تقریباً دو ہفتے میرے اسی کیف و سرور' اور سوز و گداز کی کیفیت میں گزرے جن میں ماہ رمضان مبارک گزرا تھا..... بلکہ اس بار ایک نئی سعادت یہ نصیب ہوئی کہ چونکہ مولانا عبدالغفار حسن اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں حدیث کے استاد کی حیثیت سے خدمت سرانجام دے رہے تھے اور اس طرح انہیں ایک سرکاری حیثیت و وجاہت حاصل تھی لہٰذا ان کی "سرپرستی" میں میں نے مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیانی برآمدے میں مسلسل پانچ دن مغرب سے عشاء تک "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔ اور اس کے بعد بھی کئی دن تک یہ سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ پہلے میں مختصر خطاب کرتا تھا اور پھر مولانا مدظلہ مسائل و مناسک حج کی وضاحت فرماتے تھے!۔

(گویا میرے اس کتابچے کا حرم نبویؐ سے دوہرا تعلق قائم ہو گیا..... یعنی پہلا یہ کہ رمضان

مبارک کے آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے بحالت اعتکاف اس کا مطالعہ فرما کر ایک جملے میں اصلاح تجویز فرمائی اور اب ایام حج میں اس کے جملہ مضامین سلسلہ وار مسجد نبویؐ میں بیان ہوئے' ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم! ع "یہ نصیب! اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے!"

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ اس بار بھی میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کی مہمان نوازی سے بھرپور متمتع ہوا۔ اس ضمن میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکری ہو گا۔ اس لئے کہ انہوں نے واقعی میری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی..... اس کا اصل اجر تو انہیں آخرت ہی میں ملے گا۔ البتہ ایک چھوٹا سا فوری صلہ انہیں اللہ کی جانب اس صورت میں مل گیا کہ وہ ایک عرصے سے علیل تھیں اور کوئی علاج بھی ان کی طبیعت کے موافق ثابت نہیں ہو رہا تھا لیکن میرا علاج انہیں راس آ گیا..... اور ان کی صحت کسی قدر بہتر ہو گئی!

مدینہ منورہ سے فروری ۷۱ء کے پہلے ہفتے میں حج کے لئے روانگی مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور ان کے صاحب زادگان کی معیت ہی میں ہوئی۔ اور احرام بھی ہم نے ٹھیک اسی جگہ باندھا جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حجتہ الوداع کے موقع پر باندھا تھا!۔

مولانا کی معیت ہی کے طفیل اس بار حرم مکی میں بھی عین بیت اللہ کے سامنے رکن شامی کے بالمقابل "رملہ" میں (کنکریوں والے پلاٹ جو اب ختم ہو گئے ہیں!) مغرب اور عشاء کے مابین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر متعدد تقاریر کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور مجھے آج تک ان مبارک لمحات کا کیف و سرور اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں مکی دور کے بعض واقعات کو بیان کرتے ہوئے بیت اللہ اور حرم کی سرزمین کی جانب اشارہ کرتا تھا اور مثلاً یہ کہتا تھا کہ "یہی وہ جگہ ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ جب آنحضورؐ نماز میں کھڑے تھے ابوجہل نے اپنی چادر کو رسی کی صورت میں بٹ کر اس کا پھندہ آپؐ کی گردن مبارک میں ڈال کر اس طرح مروڑا تھا کہ آپؐ کی آنکھیں ابل پڑی تھیں!" تو پورے مجمع پر شدید رقت طاری ہو جاتی تھی اور ہر شخص کے دل میں وہی جذبہ موجزن ہو جاتا تھا جس کی تعبیر کبھی اسی تحریکی دور میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ میں کی تھی کہ..... "بدقسمت ہوں

ہمارے وجود اگر اس راہ میں ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے!"

جیسے کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے' میں نے پہلی بار حج مئی ۱۹۶۲ء میں والدین کی معیت میں کیا تھا۔ (اس مرتبہ یہ عجیب اتفاق ہوا تھا کہ جس روز ہم نے کراچی سے جدہ ہوائی سفر کیا وہ میری ۳۰ ویں سالگرہ کا دن تھا' یعنی ۲۶ر اپریل ۱۹۶۲ء) اس وقت تک حجاج کرام کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی' لہٰذا حج کے دوران بڑا سکون و اطمینان اور ہر طرح کی دلجمعی حاصل رہی تھی..... اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۰ر تا ۱۲ر ذی الحجہ قیام منیٰ کے ایام واقعتاً الفاظ نبویؐ ایام اکل و شرب" کے مصداق ایک نہایت پاکیزہ جشن یا اہل تقویٰ کی پکنک کے مانند گزرے تھے..... اور سید عقیل عطاس کے احاطے میں حاجیوں کے خیمے فاصلے سے اس طرح لگے ہوئے تھے کہ کسی تنگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا اور قربانی کا گوشت پکانے کے لئے جا بجا کھلے میدان میں چولھے جلتے نظر آتے تھے.....

لیکن افسوس کہ اس بار اگرچہ حج کے جملہ مناسک تو بحمد اللہ بحسن و خوبی ادا ہو گئے تاہم وہ دلجمعی قطعاً حاصل نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ ایک تو گزشتہ نو سالوں کے دوران حاجیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی..... اور دوسرے ان غیر ملکی لوگوں (بالخصوص پاکستانیوں) نے جو بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم تھے..... اور ہر سال محض تفریح طبع یا وقت گزاری کے لئے حج پر چلے آتے تھے' حج کے تقدس کو بری طرح پامال کر دیا تھا چنانچہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے عرفات کے میدان میں کچھ لوگوں کو تاش کھیلتے ہوئے دیکھا اور خاص طور پر اس صورت حال سے تو طبیعت بہت ہی منغّض ہوئی کہ چونکہ یہ لوگ معلّموں کے خیموں کا کرایہ ادا کرنے سے بچتے تھے اور سڑکوں اور راستوں ہی پر ڈیرہ ڈال دیتے تھے' لہٰذا ہر چہار طرف گندگی پھیل جاتی تھی..... (یہ صورت حال ۱۹۷۴ء اور پھر ۱۹۷۹ء کے حج کے موقع پر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ نظر آئی۔ البتہ ۱۹۸۶ء میں اگرچہ اژدہام تو بے انتہا تھا' لیکن بحمد اللہ اس اعتبار سے صورت حال بہتر نظر آئی۔ اس لئے کہ سعودی عرب کی حکومت نے غیر ملکی کارکنوں اور ملازموں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ پانچ سال میں صرف ایک بار حج کر سکتے ہیں۔) ..... تاہم ایام حج میں میں اپنی اس الجھن کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا جس پر سوچ بچار کو میں نے

اسی موقع کے لئے مؤخر کر دیا تھا۔

وہ الجھن یہ تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ کر تو رہا ہوں کہ حصول معاش کے واحد ذریعے یعنی مطب کو بند کر دیا جائے در آں حالیکہ دوسرا کوئی مرئی اور محسوس و مشہود ذریعہ سرے سے موجود نہیں ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر "اندھے" اعتماد (BLIND FAITH) کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی..... اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس پر میرے دل کو مطمئن کر دیا ہے..... لیکن ایک پہلو سے میرا یہ فیصلہ "خلافِ قرآن" ہے' اس لئے کہ قرآن مجید نے انسان کی شعوری پختگی کی عمر چالیس سال قرار دی ہے بفحوائے آیت قرآنی "حتّٰی اذا بلغ اشدّہ و بلغ اربعین سنۃ.....الایہ" (سورۂ احقاف۔ آیت نمبر ۱۵) اور میں اتنا بڑا اقدام اس وقت کر رہا ہوں جبکہ ابھی پورے انتالیس سال کا بھی نہیں ہوا۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ یہ آیہ مبارکہ اور اس کے حوالے سے یہ خیال کہ انسان کی نفسیاتی اور شعوری پختگی کی عمر چالیس سال ہے' بہت عرصہ سے میرے ذہن میں موجود تھا..... چنانچہ نومبر ۱۹۶۵ء میں جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا' اور اس صدمے کا غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے برادرم وقار احمد کی معیت میں وادی کاغان کا رخ کیا (جس میں میں اپنی پرانی ہلمین کار میں وادی کاغان کے درمیانی مقام جرید تک پہنچ گیا تھا)..... تو جاتے یا آتے ایک دن کا قیام ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر ہوا..... وہ نومبر کی ۲۶ر تاریخ تھی اور مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا یوم پیدائش ہے۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ان دنوں میرے تعلقات ان سے خاصے کشیدہ تھے' میں نے ایبٹ آباد ہی سے انہیں ایک خط تحریر کیا تھا کہ: آج آپ انتالیس سال پورے کر کے چالیسویں میں داخل ہو گئے ہیں' اور یہی از روئے قرآن انسان کی پختگی کی عمر ہے' لہٰذا آپ ذرا اپنے ماضی اور حال پر دوبارہ نظر ڈالیں..... اور غور کریں کہ عنفوان شباب میں آپ نے تحریک اسلامی کا دامن کن جذبات اور احساسات اور کن عزائم اور امنگوں کے ساتھ تھاما تھا..... اور اب آپ بالکلیہ کن مشاغل و مصروفیات میں منہمک ہیں!..... اپنے اس خط میں بھی میں نے پوری آیہ مبارکہ درج کر دی تھی اور پھر لاہور واپسی پر "میثاق" کے خوشنویس صاحب

سے اس کی خوشنما کتابت کرا کے بھی ارسال کر دی تھی۔ اور بعد ازاں اس کا چربہ "میثاق" میں بھی شائع کر دیا تھا۔ (اور اب بھی اس کا عکس اس تحریر کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیا جا رہا ہے)

مزید برآں اسی آیہ مبارکہ کے حوالے سے میرے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال بھی آتا تھا کہ بعض سابق داعیان و خادمان دین کی مساعی میں ثبات و استقلال کی کمی کا سبب بھی شاید یہی تھا کہ انہوں نے اپنی دعوت و تنظیم کا آغاز نیم پختہ عمر میں کر دیا تھا۔ چنانچہ آغاز تو بلاشبہ ؎ "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!" ..... اور ؎ "آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم! " والا تھا لیکن افسوس کہ انجام بھی ؎ "ہو گئے خاک 'انتہا یہ ہے!" سے مختلف نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ خود میں نے اس وقت تک ایک "داعی" کی حیثیت سے سامنے آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اور میں اپنی حیثیت واقعتاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم یا زیادہ سے زیادہ خادم کی سمجھتا تھا..... اور اس وقت بھی میرے سامنے اصل مسئلہ کسی نئی صورت یا جماعت کے آغاز کا نہیں تھا' بلکہ صرف تعلیم و تعلم قرآن کی ہمہ وقت و ہمہ تن خدمت کے لئے مطب کو بند کر دینے کا تھا..... لیکن چونکہ یہ بھی بجائے خود ایک بڑا فیصلہ تھا لہٰذا مجھے اس میں تردّد اور تذبذب تھا کہ آیا مجھے چالیس سال کی عمر سے قبل اتنا بڑا اقدام کر گزرنا چاہئے یا نہیں؟

عرفات میں میں نے اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی اور بار بار دعاء استخارہ کو دہرایا..... لیکن تذبذب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن واپسی پر ایک روز حرم میں بیٹھے ہوئے اچانک دماغ میں بجلی سی کوندی اور دفعتہً یہ خیال دل میں آیا کہ قرآن کی تقویم قمری ہے 'اور قمری سال شمسی سال سے دس دن کے قریب چھوٹا ہوتا ہے..... اب جو اپنی عمر کا حساب لگایا تو سارے عقدے ایک دم حل ہو گئے 'اس لئے کہ اس وقت شمسی حساب سے میری عمر انتالیس برس سے لگ بھگ ڈھائی ماہ کم تھی..... گویا کہ قمری حساب سے میں تقریباً چالیس برس کا ہو چکا تھا!

لہٰذا اسی وقت آخری فیصلہ بھی کر لیا اور اللہ سے عہد بھی باندھ لیا کہ۔ "پروردگار! میں

عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد سے اپنی توانائیوں یا صلاحیتوں یا اوقات کا کوئی حصہ تلاش معاش میں صَرف نہیں کروں گا..... اور اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت تیری کتاب مبین اور تیرے دین برحق کی خدمت کے لئے وقف رکھوں گا..... رہا میری اور میرے اہل و عیال کی معاش کا معاملہ تو وہ کلّیتہً تیرے سپرد ہے'۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

(جاری ہے)

ضمیمہ جات

(۱)

اقتباس از تذکرہ و تبصرہ 'میثاق'
بابت دسمبر ۷۲ء

"قارئین 'میثاق' گواہ ہیں کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات میں جماعت اسلامی پاکستان کے چاروں شانے چت ہو جانے کے بعد ہم نے ان صفحات میں کبھی جماعت یا مودودی صاحب کا ذکر تک نہیں کیا۔ سوائے اوائل ۷۲ء میں سقوط مشرقی پاکستان پر بحث کے دوران ایک مختصر سے تذکرے کے جس کی حیثیت بالکل ضمنی تھی!

اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جماعت کی پالیسی سے ہمارا اختلاف ختم ہو گیا بلکہ صرف یہ تھا کہ ایسی عبرتناک شکست اور ذلت آمیز ناکامی کے بعد مزید تنقید "مرے کو ماریں شاہ مدار" کے مترادف ہوتی چنانچہ اس کے باوجود کہ متعدد حضرات نے شدت کے ساتھ تقاضا کیا کہ جماعت اسلامی کی عبرتناک شکست پر مفصل تبصرہ کیا جائے' ہماری غیرت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ چند سطور اسی طرح کی لکھ دیتے کہ "دیکھ لو! سیاسی معاملات میں ہماری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی یا تمہاری لن ترانی؟" یا کم از کم یہ شعر ہی پیش خدمت کر دیتے کہ۔

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

اس کے بالکل برعکس ہماری دلی کیفیت' خدا شاہد ہے' تأسف آمیز ہمدردی ہی کی رہی۔ یہاں تک کہ جب مکہ معظمہ میں مودودی صاحب کی اس تقریر کا ریکارڈ سننے میں آیا جو انہوں نے انتخابات میں ناکامی کے فوراً بعد "عذر گناہ" کے طور پر انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں کی تھی تو واقعہ یہ کہ دل میں شدید ہمدردی کا داعیہ ابھر آیا تھا اور یہاں تک خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب دوبارہ جماعت میں شامل ہو جانا چاہئے۔

اور ہمیں اب اس راز کے افشاء میں بھی کوئی باک نہیں کہ اگر کہیں واقعتاً مودودی صاحب کو یہ توفیق حاصل ہو جاتی کہ وہ بقول علامہ اقبال مرحوم منطق کی ایچ پیچ والی دلیلوں میں مہارت دکھانے کے بجائے "اخلاص و مروت" کی روش اختیار کرتے ہوئے صاف صاف اقرار کر لیتے کہ ہماری بعد از قیام پاکستان کی پالیسی غلط ثابت ہو گئی ہے اور اب ہم دوبارہ اپنے سابقہ طریق کار ہی پر عمل پیرا ہو جائیں گے تو کم از کم راقم الحروف تو اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لئے دوبارہ پیش کر ہی دیتا (چاہے جماعت اسلامی کی "بیوروکریسی" اس پیشکش کو ٹھکرا ہی دیتی!) اس لئے کہ دوسرے جتنے بھی معاملات میں راقم کو اختلاف ہی نہیں شدید اختلاف ہے وہ سب مودودی صاحب کے ذاتی افکار و نظریات سے متعلق ہیں۔ جماعت کی پالیسی سے نہیں!"

(۲)

اقتباس از "اسلام اور پاکستان"
شائع شدہ جنوری ۸۳ء

"اس ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا۔ جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔

لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے..... میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبّین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا..... اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے۔ (یہ اطلاع جناب عبدالرحیم' ڈپٹی چیف مکینیکل انجینئر' کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی ملاقات میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ۔ "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!") جس کی تائید مزید مجھے بفلو میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ' ان کے الفاظ میں۔ "..... ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن....." بہرحال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدان حشر میں جب میں ان سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔"

(۳)

سورۂ احقاف کی جس آیۂ مبارکہ کا حوالہ راقم نے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے نام اپنے ۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء کے خط میں دیا تھا۔ بعد میں اس کی خوشنما کتابت کرا کے اسے ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور آخری الفاظ حذف کر کے "چالیسویں سالگرہ" کے عنوان سے "میثاق" میں بھی دو بار۔ شائع کیا گیا۔ سامنے کے صفحے پر اصل کتبہ کا عکس دیا جا رہا ہے۔ (اسرار احمد)

حَتّٰٓی

یہاں تک کہ

اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ

جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچتا ہے

وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً

اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے

قَالَ

تو کہتا ہے کہ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىہُ

اور ایسے نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ

اور میری اولاد کو میرے لیے بھلائی کا ذریعہ بنا

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں — اور — میں فرمانبرداروں میں سے ہوں!

(سورۃ احقاف - آیت - ۱۵)

بڑے بھائی کی خدمت میں — چالیسویں سالگرہ کے موقع پر

منجانب ——— خاکسار انوار احمد عفی عنہ

اعلان داخلہ

قرآن کالج — لاہور

الحمدللہ کہ گذشتہ سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا باضابطہ آغاز ہو چکا ہے۔ اِس اسکیم کے تحت ایف۔ اے، ایف۔ ایس۔ سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اور تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تکمیل بھی کرا دی جاتی ہے۔ جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ چنانچہ اِس سلسلے میں:

- ایف اے، ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۸۸ء ہے۔ جبکہ داخلہ ٹیسٹ یا انٹرویو ان شاء اللہ اکتوبر کے مہینے میں ہوگا۔ جس کی معینہ تاریخ سے درخواست دہندگان کو مطلع کر دیا جائے گا۔
- ذہین اور مستحق طلبا کے لیے اخراجات میں رعایت کی گنجائش بھی ممکن ہے۔
- بیرونِ لاہور کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام پانچ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر روانہ کریں۔

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۸۳

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ نشست ۵۴

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۱)

اِس سورۂ مبارکہ کا تعارف اور اس کے مضامین کا تجزیہ گذشتہ ماہ کے میثاق میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس شمارے سے اس سورہ مبارکہ کے درس کی اقساط ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہیں۔

(ادارہ)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (صَدَقَ اللّٰہُ العَظِیْم)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے جس کی تلاوت ابھی آپ نے سماعت فرمائی اور اس کا ترجمہ بھی سنا۔ مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے' اس کا درس نمبر چودہ اس پوری سورۂ مبارکہ پر مشتمل ہے..... ترتیب مصحف کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ جو اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ہے' ۲۶ویں پارے میں سورۃ الفتح کے فوراً بعد وارد ہوئی ہے..... اگر اس کے مضامین پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات میں جو مضامین آئے ہیں' یہ پوری سورۂ مبارکہ ان کی مزید تشریح اور توضیح پر مشتمل ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں ربطِ مضمون کے اعتبار سے اس کا جو مقام ہے' اسے بھی ذہن میں تازہ کر لینا انشاء اللہ مفید ہو گا..... اس منتخب نصاب کا تیسرا حصہ اعمالِ صالحہ کے مباحث پر مشتمل ہے..... اعمالِ انسانی کے ضمن میں پہلے دو دروس میں انفرادی سیرت و کردار سے متعلق قرآن مجید کی رہنمائی ہمارے سامنے آئی تھی۔ اس کے بعد ایک درس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم ہے یعنی گھریلو زندگی' خاندان کا ادارہ' عائلی نظام' اس سے متعلق ہم نے پوری سورۃ التحریم پڑھی تھی..... اجتماعی زندگی میں اس سے بلند تر سطح پر ہماری معاشرتی یا سماجی زندگی کا دائرہ ہے۔ اس کے متعلق ہم نے گذشتہ چار نشستوں میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیا تھا..... اب جو اجتماعیت کی بلند ترین سطح ہے' یعنی قومی و ملی اور سیاسی و ریاستی زندگی' اس سے متعلق نہایت اہم مضامین اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہو رہے ہیں' جس کا مطالعہ ہم اللہ کے نام اور اس کی توفیق سے آج شروع کر رہے ہیں۔

یہ بات میں نے اس سے پہلے بھی ایک موقع پر عرض کی تھی' آج اسے تازہ کر لیجئے کہ قرآن حکیم اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسی عام طور پر انسانی تصانیف ہوتی ہیں..... انسانی تصنیف میں ابواب ہوتے ہیں۔ پھر ہر باب کا ایک عنوان ہوتا ہے جو اس باب کے مضامین کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر وہ باب ذیلی عنوانات یا فصول میں منقسم ہوتا ہے اور ہر فصل میں بحث کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے' جبکہ قرآن مجید درحقیقت اس نوع کی کتاب نہیں ہے..... اسے ہم خطباتِ الٰہیہ کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ تعبیر غلط نہیں ہو گی..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران مختلف مواقع اور مراحل پر یہ خطباتِ الٰہیہ نازل ہوتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی دعوتِ توحید کو جن حالات' موانعات اعتراضات

اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آتا تھا' ان کی مناسبت سے حضورؐ کو ہدایات دی جاتی رہیں اور متعلقہ بحثیں نازل ہوتی رہیں..... ان ہی کے ضمن میں وہ دائمی و ابدی رہنما اصول بھی دے دیئے گئے جن پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی استوار دیکھنا چاہتا ہے' لیکن ان کے لئے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبر لازم ہے..... ان کو معلوم اور اخذ کرنے کے لئے آیات کے بین السطور جھانکنا پڑتا ہے..... سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے یہ چیز معین کرنی پڑتی ہے کہ یہاں کون سے دائمی اور ابدی رہنما اصول ہمیں مل رہے ہیں..... اس پہلو سے اگر غور کریں تو اگرچہ سورۃ الحجرات کے شانِ نزول کے ضمن میں ہمیں روایات ملیں گی' لیکن تفسیر قرآن کا ایک مستقل اصول ہے کہ الاعتبار لعموم اللفظ لالخصوص السبب..... یعنی قرآن مجید کے فہم کے ضمن میں اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہو گا' نہ کہ اس سبب کا جو کسی خاص واقعہ کے اعتبار سے شان نزول بنا ہے..... اگر اس عموم کو پیش نظر رکھیں گے تو واقعہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے کہ ریاست کی سطح پر اس سورہ مبارکہ میں کتنی اعلیٰ ترین اور جامع ترین رہنمائی دے دی گئی ہے..... حالانکہ تصورِ ریاست (CONCEPTOF STATE) انسانی تاریخ کے اعتبار سے ایک جدید تصور ہے' لیکن قرآن مجید نے ریاست کی سطح پر ان دائمی و بنیادی اصولوں کی رہنمائی نوع انسانی کو عطا فرما دی تھی کہ جنہیں اسلامی ریاست میں روبعمل لایا جائے گا۔ ان سب کے لئے بنیادی و اساسی رہنمائی ہمیں اس سورۂ مبارکہ میں مل جاتی ہے۔

اس سورت کو ہم بغرض تفہیم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات جان لیجئے کہ یہ تقسیم قطعی تعیین کے ساتھ نہیں ہو گی بلکہ مضامین کی (OVER LAPPING) ہو گی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کے تین حصے ہیں جو تقریباً چھ چھ آیات پر مشتمل ہیں..... پہلے حصہ میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کے جو بنیادی اصول ہیں اور جن ستونوں پر یہ عمارت کھڑی ہے' ان کو معین کیا گیا ہے..... دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کو انتشار سے بچانے' امت کی شیرازہ بندی کو قائم و برقرار رکھنے کے ضمن میں آٹھ احکام دیئے گئے ہیں' جن میں ہم دیکھیں گے کہ دو بہت اہم اور بنیادی احکام ہیں اور چھ ان دو کے مقابلہ میں نسبتاً چھوٹے احکام ہیں..... آخری حصہ میں پھر ایک تو یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ کا پوری نوع انسانی کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اور ان تعلقات کی بنیادیں کیا ہیں.....! پھر سب سے اہم مسئلہ یہ زیر بحث آتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں کسی

شخص کو شامل کرنے کے لئے معیار کیا ہے! یا زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اور اساس کیا ہے.....! پھر اسی کے ضمن میں ایک اہم مضمون آئے گا جس پر یہ سورۂ مبارکہ ختم ہو گی کہ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے.....؟ میں نے بطور تمہید ایک اجمالی اور مختصر سا جائزہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا کہ یہ ہیں وہ اہم مضامین جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت پر اپنی نگاہوں کو مرتکز کریں' فرمایا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آگے مت بڑھو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو' اور جان رکھو کہ اللہ (ہر چیز کا) سننے والا' جاننے والا ہے".....اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ جیسے ایک مسلمان فرد' اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہوتا ہے' اور اس کے لئے مادر پدر آزادی کا کہیں وجود نہیں ہے' ویسے ہی ایک مسلمان معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست بھی مادر پدر آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابند ہے.....اسلام میں آزادی کا تصور یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے لئے ہر نوع کی دوسری غلامی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے یوں ادا کیا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طور سے تعبیر فرمایا مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اٰخِیَّتِهٖ "مومن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے".....بڑی پیاری تمثیل ہے۔ ایک گھوڑا تو وہ ہے جس پر کوئی پابندی نہیں ہے' کوئی بندش نہیں ہے' وہ جدھر چاہے منہ مارے' جدھر چاہئے زقند لگائے' آزادی کے ساتھ جس طرف چاہے اور جہاں تک چاہے خوب دوڑ لگائے۔ اس کے برعکس ایک گھوڑا وہ ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے.....اب آپ فرض کیجئے کہ دس گز کی ایک رسی ہے جس سے وہ گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا دس گز کے دائرہ کے اندر وہ گھوم پھر سکتا ہے.....اس گھوڑے کو اتنی آزادی ہے کہ وہ جس طرف چاہے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جا کر بیٹھ جائے' مزید آگے جانا چاہے تو چند قدم اور اٹھا لے

لیکن دس گز سے آگے ہرگز نہیں جاسکتا' اس لئے کہ بندھا ہوا ہے..... بقول اقبالؒ ۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تو یہ نہایت بلیغ تمثیل اور تشبیہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی کہ ایک بندہ مومن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام اور اوامر و نواہی کا پابند ہے' وہ بندھا ہوا ہے..... اب ظاہر بات ہے کہ جب مسلمان فرد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہے تو مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ ان سے کیسے آزاد ہو جائے گی! مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ان احکام کی پابندی ضروری ہے میں عرض کر چکا ہوں کہ عائلی زندگی اجتماعیت کی پہلی سطح ہے' معاشرتی زندگی اس سے بلند تر سطح ہے اور سیاسی زندگی یعنی ریاستی سطح پر ہمارے معاملات' یہ اجتماعیت کا بلند ترین تصور ہے۔ پس ہر سطح اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابند ہے۔ اگر مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ موجود ہے اور ان کی ایک آزاد خود مختار ریاست قائم ہے تو اس کے معاملات میں' اس کے دستور و آئین میں اور اس کے قوانین میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہے حقیقی مفہوم اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت کے اس حصہ کا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (ترجمہ)..... "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسولؐ سے"۔ یہاں جو لفظ "تُقَدِّمُوْا" آیا ہے' اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "مت آگے بڑھاؤ"۔ اس سے آگے لفظ "اَنْفُسِکُمْ" کہ "اپنے آپ کو آگے نہ بڑھاؤ" یا لفظ "رَاْیِکُمْ" کہ "اپنی رائے کو آگے مت بڑھاؤ"۔ محذوف ماننا پڑے گا۔

بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ "اللہ اور اس کے رسول سے"..... آیت کا یہ حصہ دونوں محذوف الفاظ کے ساتھ جڑا رہے گا..... مفہوم یہ ہو گا کہ یہ ایک دائرہ ہے..... تمہاری زندگی خواہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو' خواہ اجتماعی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتی ہو' اس دائرے کے اندر اندر محدود رہنی چاہئے۔

اگر آپ غور کریں تو یہ اسلامی ریاست کی سطح پر اس کی حیات اجتماعی اور دستور اساسی کا اصل الاصول ہے' یا یوں کہئے کہ اس کی پہلی دفعہ اس آیت سے معین ہوتی ہے..... اس لئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ریاست کے ضمن میں سب سے پہلی بحث یہ آئے گی کہ حاکمیت (SOVEREIGNTY) کس کی ہے!..... آپ جانتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ

صرف اللہ کی ہے..... بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

لھذا مسلم معاشرتی نظریہ (MUSLIM SOCIAL THOUGHT) یا مسلم سیاسی خیال (MUSLIM POLITICAL THOUGHT) میں اساسی و بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ معروف الفاظ سورۂ یوسف کے ہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یعنی حکم دینے کا اختیار مطلق اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے..... اسی بات کو سورۃ الکہف میں منفی انداز میں یوں فرمایا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○ "اور وہ اپنے حکم (کے اختیار) میں کسی کو شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے"..... البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے اصول کا انسانی معاشرہ میں عملی طور پر جو نفاذ ہو گا' وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے واسطہ سے ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ تو غیب کے پردوں میں ہے اس کا حکم سب لوگوں کو براہ راست نہیں پہنچتا بلکہ اس نے اپنے احکام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنی حکمت بالغہ سے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا جس کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیین' سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم..... لہٰذا حاکمیتِ الٰہیہ کی جو عملی تشکیل ہو گی وہ سورۃ النساء کی اس آیت کے حوالے سے ہو گی کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہیں ان کی"۔ اس آیۂ مبارکہ میں "اَطِيْعُوْا" جو صیغہ امر ہے' دو مرتبہ آیا ہے' اللہ کے ساتھ بھی اور رسول کے ساتھ بھی۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی (صلی اللہ علیہ وسلم)..... لیکن آگے جب اس اطاعت کی زنجیر کی تیسری کڑی آئی تو فعل امر "اَطِيْعُوْا" کو لوٹایا نہیں گیا بلکہ فرمایا گیا۔ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں"..... اس اسلوب سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بالذات اور مطلق ہے۔ جبکہ و اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ' کی اطاعت مشروط ہو گی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرہ کے اندر اندر حکم دے سکتے ہیں' اس کے باہر نہیں۔ اس کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائمی طور پر یہ اصول الاصول معین فرما دیا ہے کہ لا طاعةَ لمخلوقٍ

فی معصیۃ الخالق یعنی کسی ایسے معاملہ میں مخلوق میں سے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی معصیت یعنی اللہ کی نافرمانی آرہی ہو۔

پس قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جو احکام دیئے گئے ہیں' ان سب کو جمع کیا جائے تو اس کا جو حاصل نکلتا ہے اسے بڑی جامعیت اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں بیان فرمادیا گیا ہے بایں الفاظ مبارکہ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (ترجمہ)..... "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے (صلی اللہ علیہ وسلم)"..... یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ بڑے دستوری' آئینی اور قانونی الفاظ ہیں اس اصل الاصول کی تعیین کے لئے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام امور و مسائل اور معاملات اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر رہیں گے' اس سے تجاوز جائز نہیں ہو گا۔ البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے حسب حالات اور حسب موقع اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اہل لغت و نحو تمام کے تمام اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ "امر" کے مقابلہ میں "نہی" میں زیادہ زور (EMPHASIS) ہے..... یعنی ایک یہ کہ حکم دیا جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"..... دوسرے یہ کہ بات یوں کہی جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو"..... تو یہ جو دوسرا انداز ہے' اس میں تاکید کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

پھر یہ کہ ہم اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ الفاظ نہایت جامع (COMPREHENSIVE) ہیں..... یہ الفاظ اس طریقہ سے اس بات کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے جو واضح احکام ہیں' ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکے گا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ان کے اندر اندر آزادی حاصل ہے جیسے گھوڑے کی مثال کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کو بس اتنی آزادی ہے کہ وہ اپنی رسی کی مقدار کے مطابق ایک معین دائرے کے اندر اندر گھوم پھر سکتا ہے اور جس سمت چاہے اور رسی کی حدود میں رہتے ہوئے جتنے فاصلے پر چاہے جا کر بیٹھ سکتا ہے۔ لہٰذا سورۃ الحجرات کے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک دائرہ کھینچ دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی حیثیت "حدود اللہ" کی ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ البتہ اس دائرے کے اندر اندر تمہیں

اختیار ہے کہ اپنے ریاستی، مملکتی اور انتظامی امور اپنی صوابدید سے طے کر سکتے ہو، اپنے قوانین بنا سکتے ہو۔

لیکن اس کے لئے بھی ایک اصل الاصول سورۃ الشوریٰ میں بیان کر دیا گیا ہے جسے اختیارات کے دائرے میں بہرحال ملحوظ رکھنا ہو گا۔ وہ اصل الاصول یہ ہے کہ۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ "اور (اہلِ ایمان) اپنے معاملات، اپنے کام باہمی مشورے سے چلاتے ہیں" (آیت ۳۸) یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرے کے اندر بھی کسی فرد واحد، کسی خاندان، یا کسی طبقہ یا کسی گروہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قوت نافذہ پر قابض ہو کر اس طرح بیٹھ جائے کہ گویا وہ اصل حکمران ہیں اور بقیہ لوگ صرف ان کی رعیت ہیں کہ جس طرح چاہیں ان پر اپنی مرضی ٹھونس دیں۔ اسلام اس نوع کے 'Totalitarianism' اور 'Authoritarianism' کی یعنی کسی فرد، طبقے، گروہ کی یا خاندان میں اختیارات کے ارتکاز کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے شورائیت کا نظام از روئے قرآن مجید لازم ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں یہ اصل الاصول اور اسلامی نظام حیات کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجتماعی امور جن کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم یا ہدایت نہ ہو، مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ البتہ یہاں شوریٰ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی گئی ہے اور اس کے بارے میں ہمیں قرآن میں کسی دوسرے مقام پر بھی کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ملتا کہ نظام حکومت کیا ہو! صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو! وحدانی ہو کہ وفاقی ہو!..... اور اگر عام انتخابات ہوں تو اس کے لئے ووٹ کا حق کسے ہے، کسے نہیں ہے۔ یہ تمام معاملات انتظامی امور ہیں۔ تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے جس سطح پر جو معاشرہ ہو گا، اس کی مناسبت سے لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ کے اصول کے پیش نظر تمام معاملات اس دائرے کے اندر اندر رہیں جو کتاب و سنت نے تمہارے لئے کھینچ دیا ہے۔ اور یہ معاملات باہمی مشورے سے انجام پائیں۔ نظام شورائیت کی کوئی معین شکل نہ دینے کی یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کے دائمی و ابدی اوامر و نواہی اور احکام ساری دنیا کے لئے، ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ہیں لہٰذا شوریٰ کا ایک خاص طریقہ ہر دور، ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لئے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ البتہ شوریٰ کا جو قاعدہ آیت کے اس حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ "(اہل ایمان) اپنے کام باہم مشاورت سے چلاتے ہیں" تو یہ

قاعدہ تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو' ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہئے خواہ وہ براہ راست شریک ہوں' یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے شریک ہوں۔ دوسرے یہ کہ مشورہ آزادانہ' بےلاگ اور مخلصانہ ہونا چاہئے۔ دباؤ یا لالچ کے تحت مشورہ لینا مشورہ نہ لینے کے برابر ہے۔ تیسرے یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اتفاق رائے سے دیا جائے یا جسے ان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق حکومت اور اجتماعیت کے تمام معاملات چلائے جائیں۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہم نے قائداعظم مرحوم و مغفور کے الفاظ میں اس لئے حاصل کی تھی کہ ہم ایک آزاد و خود مختار خطہ اس مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو ابدی اصول ہیں ہم اس مملکت کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک تجربہ گاہ بنائیں۔ اسے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ اور نمونہ کی ایک اسلامی ریاست بنا کر پوری دنیا کے سامنے پیش کریں.....

الحمدللہ ہمارے یہاں "قرارداد مقاصد" میں یہ بات طے ہو گئی کہ "حاکمیت مطلقہ اللہ کی ہے"۔ ہم نے پہلی بار اس اصول سے دنیا کو روشناس اور متعارف کرایا۔ اور یہ بات پیش نظر رکھئے کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ کسی آزاد و خود مختار اور ذمہ دار اسمبلی نے (وہ ہماری دستور ساز اسمبلی تھی) اس طریقہ سے ایک اجتماعی فیصلہ کا اعلان و اظہار کیا کہ ریاست میں حاکمیت مطلقہ اللہ کی ہے۔ اس کے متعلق ہم گویا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کی سطح پر یہ کلمہ شہادت تھا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ جس کا اعلان و اظہار قرارداد مقاصد کے ذریعے سے پوری دنیا کے سامنے ہوا۔ اور میں آج خراج تحسین ادا کرنا چاہتا ہوں اس شخص یا ان اشخاص کو جنہوں نے اس دفعہ کے الفاظ معین کئے ہیں جو ہمیشہ سے دستور پاکستان کے رہنما اصولوں میں شامل رہی ہے

"کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن اور سنت سے متخالف و متضاد اور متصادم ہو"۔

میں نہیں جانتا کہ ان کے پیش نظر یہ آیہ مبارکہ بھی یا نہیں جس کا ہم آج مطالعہ کر رہے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ کامل ترین نمائندگی کرتے ہیں اس آیہ مبارکہ کے الفاظ کی لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (ترجمہ)..... "مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے"..... اور قرارداد مقاصد کی مذکورہ دفعہ کے الفاظ

ہیں..... دستور پاکستان۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان 'قرآن مجید ہے..... اگر آپ اس سے آگے نہیں بڑھتے تو اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ آپ اللہ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت' آپؐ کے افعال' اعمال اور اقوال ہیں..... اگر ہم اس سے آگے نہ بڑھنے کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوا! یہ کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرہ کے اندر رہنے کا عزم کیا ہے..... میرے نزدیک یہ دفعہ اسلامی دستور کی جو بنیادی شرط ہے' اسے بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورا کرتی ہے۔ بشرطیکہ یہ دفعہ محض رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLES) میں نہ ہو بلکہ نافذ العمل دفعات (OPERATIVE CLAUSES) میں شامل ہو..... بدقسمتی سے ہماری کوتاہی یہ رہی ہے کہ اس کو تاحال نافذ العمل دفعہ بنانے کے بجائے صرف رہنما اصولوں میں رکھا گیا ہے..... البتہ موجودہ دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام کی صورت میں یوں سمجھئے کہ اس دفعہ پر عمل کا کسی نہ کسی درجے میں آغاز ہوا ہے..... اور دور جدید میں اسلامی ریاست کے تقاضوں میں سے ایک بنیادی تقاضے کو ناقص شکل ہی میں سہی پورا کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اللہ کرے کہ وہ دن جلد از جلد پاکستان پر طلوع ہو کہ اسلامی ریاست کے جو بھی تقاضے ہیں ان پر بھرپور انداز اور عزم بالجزم سے اقدامات شروع ہوں.....

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے ضمن میں اگر آپ حضرات کوئی سوال کرنا یا کوئی اشکال پیش کرنا چاہیں تو اس کے لئے حاضر ہوں۔

سوال و جواب

☆..... سوال..... ڈاکٹر صاحب! قرآن مجید کی رو سے انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے تو پھر اسے حکم دینے کا اختیار کیوں نہیں ہے.....؟۔

○..... جواب..... اچھا سوال ہے۔ میں نے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ یہ تھے کہ حکم دینے کا اختیار مطلق اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے' یہ جو VICEGERENCY یعنی اختیار مطلق کا معاملہ ہے یہ صرف اللہ کے لئے ہے..... البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے انسانوں کو کچھ اختیارات تفویض کئے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم اختیار تو رسولؐ کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ بھی حکم دیتے ہیں لیکن وہی حکم جو انؐ کو وحی جلی یا وحی متلو یعنی قرآن مجید کے ذریعہ سے ملتا

ہے یا جو وحی خفی یا وحی غیر متلو سے دیا جاتا ہے' جس کو ہماری دینی اصطلاح میں سنن رسول علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بصراحت ارشاد باری تعالیٰ موجود ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (ترجمہ)..... "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی" (سورہ النساء۔ ۸۰)

پھر اسی سورۃ النساء میں یہی بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ارشاد فرمائی گئی۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ترجمہ)..... "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے" (آیت ۶۴)۔ پھر یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جب انسان خلیفہ ہے تو خلیفہ اور حاکم میں یہی تو فرق ہے کہ حاکم کا اختیار مطلق ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے..... مگر خلیفہ یا نائب کا یہ فرض ہے کہ وہ اصل حاکم کی مرضی کو پورا کرے خلافت یا نیابت (VICEREGENCY) کا تصور یہی ہے۔ البتہ ایک دائرہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے اندر' جو مباحات کا دائرہ ہے۔ اس میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ شوریٰ کے مشورے سے جو مناسب سمجھے فیصلہ کرے..... اور اسلامی ریاست کے شہریوں کو ان فیصلوں کی اطاعت کرنی ہوگی۔

مزید برآں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر اطاعت کے بے شمار دائرے ہیں۔ اولوالامر کے علاوہ والدین' اساتذہ اور مرشدین کی اطاعت ہے' اسی طرح جماعتوں اور جمعیتوں کے امرا کی اطاعت ہے..... بیوی کے لئے شوہر کی اطاعت ہے..... لیکن یہ اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں مشروط ہیں اطاعت بالمعروف کے ساتھ..... اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم سے باہر کسی کی اطاعت نہیں ہے۔

☆..... سوال..... ڈاکٹر صاحب! آپ نے ترجمہ میں تقویٰ کا لفظ جوں کا توں استعمال کیا ہے..... اس کا کوئی ترجمہ پیش نہیں فرمایا..... تقویٰ کی تشریح کیا ہے! اس پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟۔

○..... جواب..... تقویٰ کی تشریح اپنی جگہ ایک اہم موضوع ہے۔ تقویٰ کا عام طور پر جو ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ تقویٰ کے اصل معنی ہیں کسی چیز سے بچنا..... قرآن نے اس میں یہ اصطلاحی معنی پیدا کئے "اللہ کی نافرمانی سے بچنا..... اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنا" یہ ہے تقویٰ کے لفظ کا دین کی اصطلاح میں اصل مفہوم اور یہ مفہوم اس آیت

مبارکہ میں بڑی خوبصورتی سے آیا ہے۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (ترجمہ) ..... "اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو اور اس کے احکام کو توڑنے سے بچو"۔ یہی تقویٰ اصل میں وہ جذبہ محرکہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی پر کسی مسلمان فرد یا کسی مسلمان معاشرے یا کسی اسلامی ریاست کو آمادہ کرتا ہے۔

حضرات! آج ہم نے سورۃ الحجرات کی پہلی آیت پر کچھ غور کیا ہے۔ یہ مضمون ابھی کئی نشستوں میں چلے گا اور اگلی نشست میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی جو اصلِ ثانی ہے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی شخصیت۔ انشاء اللہ اس پر گفتگو ہوگی۔

اقول قولی هذا و استغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حقیقتِ جہاد

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر

حقیقتِ جہاد کے موضوع پر میری آج کی گفتگو درحقیقت تتمہ ہے میری ان تقاریر کا جو حقیقتِ ایمان کے موضوع پر ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ از روئے قرآن ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایمان حقیقی معنوں میں موجود ہو گا تو جہاد لازماً موجود ہو گا۔ ان دونوں کے مابین ایسا گہرا رشتہ و تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ایمان کی حقیقت پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر جہاد کی حقیقت پر گفتگو کو بھی اس میں شامل نہ کیا جائے۔

جہاد کے بارے میں چند مغالطے

جہاد کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں چند در چند قسم کے مغالطے ہیں لہٰذا میں سب سے پہلے انہی مغالطوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی وجہ سے جہاد کے بارے میں ہمارا پورا تصوّر مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے بڑا اور بنیادی مغالطہ یہ ہے کہ جہاد کے معنی جنگ سمجھ لئے گئے ہیں اور لفظ جہاد ذہن میں آتے ہی جنگ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جنگ یا قتال اگرچہ بلاشبہ جہاد کی آخری اور تکمیلی شکل ہے لیکن جہاد کے معنی جنگ نہیں ہیں۔ بلکہ جہاد اور قتال کے مابین وہی رشتہ و تعلق ہے جو اسلام اور ایمان کے مابین یا نبوت اور رسالت کے مابین ہے۔ یعنی جس طرح اسلام عام ہے 'ایمان خاص ہے اور نبوت عام ہے' رسالت خاص ہے اسی طرح جہاد عام ہے' قتال خاص ہے۔ جنگ کے لئے قرآن مجید کی جو اصل اصطلاح ہے وہ قتال ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ○ "جنگ کرو ان سے یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے"۔

(الانفال۔ ۳۹) اسی قتال کے بارے میں فرمایا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "تم پر جنگ فرض کر دی گئی اور اب وہ تمہیں ناگوار اور گراں محسوس ہو رہی ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو در آنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تم محبت کرو در آنحالیکہ اس میں تمہارے لئے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے"۔ (البقرۃ۔ ۲۱۶) قتال کے بارے میں چوٹی کی آیت سورۃ الصف کی آیت نمبر ۴ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○

"اللہ تو محبت کرتا ہے اپنے ان بندوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ تو جنگ کے لئے قرآن مجید کی اپنی اصطلاح ہے قتال۔ جہاد دین کی بہت وسیع اصطلاح ہے۔ اس کا ایک جزو بلکہ ایک تکمیلی مرحلہ قتال ہے۔

جہاد فرض کفایہ یا فرض عین

جہاد اور قتال دونوں کو مترادف اور ہم معنی سمجھ کر لازم و ملزوم جان لینا یہ وہ چیز ہے کہ جس نے پوری سوچ اور پورے نقطۂ نظر کو بنیادی طور پر غلط کر کے رکھ دیا ہے۔ چونکہ ذہن میں جہاد کے معنی جنگ ہو گئے لہٰذا اب بنائے فاسد علی الفاسد کے طور پر جب استدلال کی بنیاد ایک غلط تصوّر پر اٹھے گی تو مزید غلطی ہو گی۔ چنانچہ ہمارے ہاں جس نئی نبوت نے ظہور کیا اس نے تو جہاد کو ساقط ہی کر دیا۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی کا یہ شعر ہے کہ "دین کے لئے حرام ہے اے دوستو قتال"۔ اور جب ذہنوں میں یہ تصور ہو کہ قتال ہی جہاد ہے تو جہاد بھی یکسر خارج از بحث ہو گیا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ یہ ٹھوکر اسی نے کھائی ہے بلکہ جہاد کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں بھی ایک مغالطہ موجود ہے کہ یہ فرضِ عین نہیں 'فرضِ کفایہ ہے۔ یہ درست ہے کہ قتال ہر وقت فرض نہیں ہوتا۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران بھی صرف جنگِ تبوک ہی ایک ایسی جنگ تھی جس میں ہر مسلمان پر یہ فرض کر دیا گیا تھا کہ وہ نکلے۔ اس سے پہلے کبھی بھی نفیرِ عام نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس کے لئے ترغیب دی گئی' شوق دلایا گیا۔ اللہ کی راہ میں گردن کٹوانے کا جذبہ پیدا کیا گیا لیکن اس کو فرضِ عین قرار نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی کسی جنگ میں نہیں گیا تو اس سے محاسبہ بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہمارے ذہنوں میں جہاد کے بارے میں بھی یہ تصور قائم ہو گیا کہ یہ بھی فرض کفایہ ہے۔

فرضِ عین وہ ہوتا ہے جو ہر حال میں ہر آن فرض ہے۔ نماز فرضِ عین ہے لہٰذا اگر جنگ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آ جائے تو ادا کرنی ہوگی۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کہ زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

اور اگر کوئی ایسا ہی شدید وقت ہے کہ ساری جماعت کے لئے بیک وقت ادائیگی ممکن نہیں تو صلوٰۃ الخوف کا پورا ایک نقشہ بیان کر دیا گیا ہے کہ آدھی فوج محاذ پر رہے اور آدھی نماز ادا کرے اور پھر یہ جائیں اور دشمن کا سامنا کریں اور جو رہ گئے ہیں وہ نماز ادا کریں۔ اسی طرح اگر بیماری کے باعث وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو۔ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ لیٹ کر پڑھ لو۔ حتیٰ کہ اشارے سے پڑھ لو لیکن یہ وہ فرضِ عین ہے کہ کسی صورت بھی اس سے استثناء نہیں ہے۔ تو یہ فرضیت تو ہم مسلمانوں کے ذہنوں پر بجا طور پر مسلط ہو گئی لیکن ہم نے اپنے ذہنوں میں جہاد کے معنی چونکہ جنگ سمجھے اور جنگ ہر حالت میں فرض نہیں ہے' لہٰذا جنگ کے متعلق سارے تصورات لفظ جہاد کے ساتھ وابستہ ہو گئے کہ جہاد بھی فرض عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ اصل میں مغالطہ یہیں لاحق ہوا ہے ورنہ یہ بات غلط نہیں ہے کہ جنگ فرضِ عین نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کے پورے پندرہ برس کے دوران جنگ ممنوع تھی' بلکہ جنگ تو بہت دور کی بات ہے مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ اس وقت کچھ پرجوش لوگ اجازت طلب کرتے تھے اور بار بار کہتے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اس وقت ان سے کہا گیا کہ۔ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔ نہیں 'اپنے ہاتھ بندھے رکھو! ماریں کھاؤ' جھیلو' برداشت کرو' یہاں تک کہ تمہیں دیکھتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹا دیا جائے تو لیٹ جاؤ لیکن اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ تو جب اقدام کا مرحلہ آیا تو مدافعت میں ہاتھ اٹھانے اور پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ملی۔ چنانچہ جنگ یقیناً فرضِ عین نہیں ہے۔ وہ تو جب اس کا مرحلہ آئے گا تب ہی فرض ہوگی اور فرضِ کفایہ ہی رہے گی۔ نفیرِ عام کا حکم تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے تھے۔

جہاد ایمان کا رکن ہے

جنگ اور قتال کے تصور کو جہاد کے ساتھ ہی کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دینی تصورات میں جہاد اپنے اصل مقام و مرتبہ سے ہٹ کر صرف ایک فرضِ کفایہ کے درجے میں رہ گیا۔ حالانکہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جہاد ایمان کا رکن ہے۔ اس کو اب آپ اس حوالے سے سمجھئے

کہ ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایک قانونی ایمان جس کی بنیاد پر ہم دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اسی کے لئے اصطلاح ہے اسلام۔ اسلام میں ایمان کا "اقرارٌ باللسان" والا جزو شامل ہے۔ یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گواہی اسلام کا پہلا رکن ہے۔ اس کے ساتھ چار ارکان اور شامل کر لیجئے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، تو یہ پانچ ارکان ہو گئے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اب ایمان کے دوسرے جزو "تصدیقٌ بالقلب" کو لیجئے جس کا تعلق حقیقی ایمان سے ہے۔ اس کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کو شامل کیجئے تو یہ ایمان کے دو رکن ہیں۔ یہ بات سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ سے بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ.....

"یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے نبیؐ ان سے فرما دیجئے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں (یعنی ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے، ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے، ہم نے مزاحمت اور مقابلہ چھوڑ دیا ہے) اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ اب اگر جاننا چاہتے ہو کہ ایمان اصل میں کیا ہے اور حقیقی ایمان کی کسوٹی اور معیار کیا ہے تو جان لو کہ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا "مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے"۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا نے بات واضح کر دی کہ یہاں تصدیق بالقلب والے ایمان کا ذکر ہے اور تصدیق بالقلب بھی ایسی کہ جو یقین کی کیفیت اختیار کر چکی ہو، جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں۔

وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں"۔ تو یہ ہوئے ایمانِ حقیقی کے دو ارکان..... رکنِ اوّل دل میں یقین اور رکنِ ثانی عمل میں جہاد فی سبیل اللہ۔

اس بات کو سمجھ لینے سے وہ اصل مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آیا جہاد فرض کفایہ ہے یا فرضِ عین۔ قانونی سطح پر یہ ماننا پڑے گا کہ جہاد فی سبیل اللہ ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے۔ تو جو

کوئی محض قانونی سطح پر دنیا میں مسلمان کہلوائے جانے پر قانع ہو اور اسے آخرت کی کوئی پروانہ ہو تو اس کے لئے تو معاملہ بڑا آسان ہے۔ اسے جہاد کا کھکھیڑ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جسے یہ تشویش ہو کہ میں اگر مسلمان بنا ہوں تو صرف اس دنیا میں مسلمان کہلوانے کے لئے نہیں بنا بلکہ مجھے تو اصل میں آخرت درکار ہے' میرا مطلوب و مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جہنم سے چھٹکارا پانا ہے تو وہ جان لے کہ پھر جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اس سے بچاؤ کی کوئی امکانی صورت اور اس سے کوئی استثناء (EXEMPTION) سرے سے ہے ہی نہیں! اس لئے کہ اس آیت کے اول و آخر میں حصر کا اسلوب ہے۔ شروع میں اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ..... مومن تو صرف وہ ہیں' مومن تو بس وہی ہیں۔ یعنی حقیقی مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ آخر میں پھر حصر ہے۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ بس یہی لوگ ہیں سچے۔ یعنی اپنے دعوائے ایمان میں تو بس وہی لوگ سچے ہیں جو ان دونوں شرطوں کو پورا کریں۔ دل میں یقین اور عمل میں جہاد۔

جہاد کا مفہوم

جہاد کی اہمیت اور اس کی حیثیت سے آگاہی کے بعد اب ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ جہاد ہے کیا! سب سے پہلے لفظ جہاد کے لغوی معنی سمجھئے۔ اس کا مادہ (ROOT) جہد (ج ہ د) ہے۔ لفظ جہد ہماری زبان میں بالکل صحیح مفہوم میں مستعمل ہے۔ عربی زبان کے بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو میں آکر اپنے اصل مفہوم کے بجائے دوسرے معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ لیکن لفظ "جہد" اردو میں بھی بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو مفہوم اس کا عربی میں ہے۔ یعنی کوشش' کسی کام کے لئے محنت کرنا۔ لیکن جب یہ باب مفاعلہ میں آتا ہے تو اس میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ دو فریقوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر جہدو کوشش کرنا اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرنا۔ عربی زبان میں مفاعلہ کے وزن پر جو مصدر آتے ہیں ان میں سے اکثر میں یہ دونوں مفہوم ملیں گے۔ مثلاً مباحثہ دو فریقوں کا آپس میں بحث کا تبادلہ ہے۔ جب ایک وکیل یکطرفہ دلائل دے رہا ہوتا ہے تو اسے بحث کہا جاتا ہے' لیکن جب دو فریق آمنے سامنے آکر ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے بحث کرتے ہیں اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مؤقف کو غلط اور اپنے اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل دیئے جاتے ہیں تو یہ چیز مباحثہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح کافرق قتل

اور مقاتلہ میں ہے۔ قتل ایک یکطرفہ عمل ہے۔ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا' بغیر اس کے کہ دوسرے کا بھی اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ تھا تو یہ قتل ہے۔ البتہ جب دو افراد' دو گروہ' دو فوجیں یا دو جماعتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آ جائیں اور دونوں کا ارادہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کا ہو تو اب یہ قتل نہیں رہے گا' مقاتلہ بن جائے گا' مفاعلہ کے وزن پر۔ تو اسی طور پر جہد سے مجاہدہ بنتا ہے۔ جب دو جہدیں ایک دوسرے کے سامنے آ کر باہم ٹکرا رہی ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کے درپے ہوں تو یہ مجاہدہ ہے۔ اسی کو فِعال کے وزن پر جہاد کہا جاتا ہے' کیونکہ باب مفاعلہ کے مصدر فِعال کے وزن پر بھی آتے ہیں۔ مثلاً مقاتلہ اور قتال' مجاہدہ اور جہاد' مجادلہ اور جدال' منافقہ اور نفاق' مفاعلہ کے وزن پر بھی آتے ہیں اور فعال کے وزن پر بھی۔

جہاد کے لئے اگر آپ فارسی میں مترادف لفظ تلاش کریں تو وہ ہو گا کشمکش' بلکہ کشاکش۔ جہد جو یکطرفہ عمل ہے' اس کے لئے بھی ہم نے جو لفظ "کوشش" تلاش کیا تھا وہ بھی اصل میں فارسی کا لفظ ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ دو طرفہ جدّوجہد میں دو فریقوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں کوشش کرنا اور اس میں ہر ایک کو دوسرے کے زیر کرنے کی فکر ہونا "کشمکش" کہلاتا ہے۔ (ویسے اس کے لئے صحیح لفظ "کشاکش" ہے۔ لیکن اردو میں "کشمکش" زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔) تو جو فرق کوشش اور کشمکش میں ہے وہی جہد اور مجاہدہ میں ہے۔ انگریزی میں اس کا مترادف (EQUIVALENT) ہو گا TO STRUGGLE یعنی مقابلے میں موجود مزاحمت (RESISTENCE) سے نبرد آزما ہو کر اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنا۔ اور یہی کشمکش اور مجاہدہ ہے۔

ہر کوئی کسی نہ کسی راہ کا مجاہد ہے

دوسری بات اب یہ سمجھئے کہ دنیا میں ہر شخص مجاہد ہے۔ جہاد کے مختلف درجات (LEVELS) ہیں لیکن کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو مجاہدہ نہ کر رہا ہو۔ آپ کاروبار میں اپنے کسی قریب کے دوکاندار سے مسابقہ (COMPETITION) کر رہے ہیں۔ گاہک کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے وہ بھی ہر ممکن زور لگا رہا ہے اور آپ بھی لگا رہے ہیں تو یہ مجاہدہ ہی تو ہے۔

حفیظ نے شاہنامۂ اسلام میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بھی لکھے تھے۔ آٹھویں جماعت میں میں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ ان میں ایک شعر بڑا پیارا لگا تھا۔

مجھے مسجد سے مکتب کی طرف تقدیر نے کھینچا
تنازع للبقاء کی آہنی زنجیر نے کھینچا

یعنی میری تعلیم کا آغاز تو مسجد سے ہوا تھا لیکن پھر وہ جو بازار گرم تھا RUGGLE FOR EXISTENCE کا اس کی وجہ سے پھر مجھے مسجد کی تعلیم کو چھوڑ کر سکول کی طرف آنا پڑا۔ یہ "تنازع للبقاء" (STRUGGLE FOR EXISTENCE) ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء کا بڑا بنیادی نکتہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نظریہ درست ہے یا غلط' اس کی رائے میں ارتقاء (EVOLUTION) کا سبب یہ ہے کہ وسائلِ حیات محدود ہیں اور زندہ رہنے کی خواہش رکھنے والے LIVING ORGANISMS کو اس کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کرنا پڑتی ہے۔ اور اس مسابقت کے نتیجے میں "بقائے اَصلح" (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے اصول کے مطابق جو اپنے آپ میں ماحول کے ساتھ جتنی مطابقت' ساز گاری اور ہم آہنگی پیدا کر لے گا' اس کے باقی رہنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ اور جو ماحول سے ساز گاری اور ہم آہنگی اختیار نہ کر سکے گا' ختم ہو جائے گا۔ جس ORGANISM نے اپنے ماحول سے ساز گاری کے لئے اپنے اندر تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی تو پھر اس کی نسل میں یہ تبدیلی بڑھتی چلی جائے گی اور بڑھتے بڑھتے ایک نئی نوع (SPECIES) وجود میں آجائے گی۔ تو یہ ہے اس کا ارتقاء کا فلسفہ جس کی پہلی اینٹ تنازع للبقاء ہے۔ یعنی دنیا میں باقی رہنے کے لئے مجاہدہ اور کشمکش ناگزیر ہے۔ یہی مجاہدہ اور جہاد ہر شخص کر رہا ہے۔ ہر کوئی اس بھاگ دوڑ اور کشمکش میں ہے کہ وسائلِ حیات کے حصول میں وہ دوسرے سے بازی لے جائے۔ اسی کے لئے محنت' کوشش اور جدّوجہد ہو رہی ہے۔ راتوں کا جاگنا اور دن بھر کی مشقت اسی کی خاطر ہے۔ یہ مجاہدہ ہم میں سے ہر شخص کر رہا ہے لیکن یہ مجاہدہ فی سبیل النفس ہے۔

جو لوگ اس سطح سے ذرا اوپر اٹھ جاتے ہیں اور جن کا کوئی نظریہ' کوئی آئیڈیل' کوئی فلسفہ اور اپنا کوئی خاص نقطۂ نظر بھی ہو تو انہیں پھر اس کے لئے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص جو وطنیت کا قائل اور وطن کی عظمت کا پجاری ہے وہ وطن کی عزت و عظمت اور سربلندی کے لئے جدوجہد کرے گا۔ اپنے وطن کی سالمیت کے خلاف کوئی دوسرا وطن خطرناک عزائم رکھتا

ہو تو اس سے اپنے ملک کے تحفظ اور بقاء کی خاطر جدوجہد اور کشمکش مجاہدہ فی سبیل الوطن ہو گا۔ ایک شخص قومیت کا پرستار ہے، نیشنلسٹ ہے تو وہ مجاہدہ فی سبیل القومیہ ہے۔ ایک شخص جو اشتراکیت کا قائل ہے اور اس کی نظر میں یہی اصل نظام ہے 'عدل قائم ہو سکتا ہے تو اسی سے ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ مخلص ہے تو جان لڑائے گا' محنت کرے گا' اور مارکسزم کو قائم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا۔ یہ مجاہدہ فی سبیل الاشتراکیہ ہے۔

اسی طرح ایک شخص ہے جو شرک کا علمبردار ہے' جیسے کہ مکہ کے لوگ تھے۔ ان کا ایک طور طریقہ تھا' ان کی روایات اور رسومات تھیں۔ ان کے اپنے عقائد اور اپنا ایک نظام تھا۔ ان کے اعتبار سے تو حضورؐ باغی تھے جو ان کی آبائی روایات کو توڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو مشرکین آبائی روایات کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ بھی مجاہد تھے۔ یعنی مجاہدہ فی سبیل الشرک یا مجاہدہ فی سبیل الطاغوت۔ چنانچہ یہ لفظ جہاد قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر مشرک والدین کے لئے استعمال ہوا ہے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا

"اگر تیرے والدین تجھ سے جہاد کریں اس پر کہ تو شریک ٹھہرائے میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو جس کے لئے تیرے پاس کوئی دلیل نہیں (نہ کوئی عقلی بنیاد ہے اور نہ کسی آسمانی کتاب میں اس کی سند ہے) تو ان دونوں کا کہنا مت مان۔" سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو بالکل نوجوان بلکہ نوعمر (TEEN-AGER) تھے۔ باپ بہت پہلے فوت ہو چکا تھا' ماں نے پالا پوسا۔ اب جو نوجوان اس عمر میں حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہا ہے آپ اس کی سعادت مندی کا تصور تو کیجئے۔ کتنا صالح اور سلیم الفطرت نوجوان ہو گا۔ اس کے دل میں اپنی والدہ کا کیا مقام ہو گا اور وہ اس کے حقوق کو کتنا پہچاننے والا ہو گا۔ اس نوجوان کے لئے کتنی بڑی آزمائش اور کتنا کٹھن مرحلہ ہے کہ ماں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے کہ اگر سعد اپنے باپ کے دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی۔ تو قرآن مجید میں یہ باتیں یونہی کہانیوں کے طور پر نہیں آئی ہیں بلکہ حقائق و واقعات تھے اور اس نوعیت کے مسائل تھے جن پر یہ ہدایات نازل ہوئیں۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا

صبر کرو' جھیلو' چاہے ماں تمہاری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دے لیکن تمہیں توحید پر قائم رہنا ہے۔ تو یہ جہاد ہے' کشمکش ہے۔ وہ ماں جو ہے مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے۔ اسی طرح

ابو جہل بھی مجاہد تھا' بلکہ وہ تو مقاتل تھا۔ اس نے اپنی ان روایات کے تحفظ کے لئے جنگ لڑی اور اپنی گردن کٹادی۔

معلوم ہوا کہ جہاد ایک UNIVERSAL PHENOMENON ہے۔ جہاں یقین ہو گا جہاد ہو گا' یقین نہیں ہو گا تو جہاد نہیں ہو گا۔ مثلاً ایک شخص مارکسسٹ ہونے کا دعویدار ہے لیکن وہ اس کے لئے جہاد نہیں کر رہا' کمیونزم کے لئے قربانیاں نہیں دے رہا' محنت اور بھاگ دوڑ نہیں کر رہا بلکہ کسی سرمایہ دار ملک کے کسی پر تعیش شہر میں آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے' وہاں مراعات حاصل کر رہا ہے' سرمایہ داروں کے ساتھ اس کے مراسم ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ اس کی موافقت ہے تو آپ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ جھوٹا اور فریبی ہے۔ اس طرح کے لوگ صرف ذہنی تعیش کے لئے مارکسسٹ بنے پھرتے ہیں۔ یہ حقیقی مارکسسٹ نہیں ہیں۔ سچا اور مخلص مارکسسٹ تو صرف وہی ہو گا کہ جو مجاہد فی سبیل الاشتراکیہ ہو۔ صداقت ہو گی تو جہاد لازماً ہو گا۔

اب ذرا آیتِ قرآنی کی طرف دوبارہ توجہ مرتکز کیجئے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○

"مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے۔ اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ بس سچے تو یہی لوگ ہیں"۔ اپنے دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ ہیں۔ سچا مارکسسٹ صرف وہ ہو گا جو مارکسزم کے لئے اپنی جان اور مال کھپائے' یہاں تک کہ وقت آنے پر جان کی بازی لگادے' پھانسی کا پھندا چوم کر گلے میں ڈال لے یا گریبان کھول کر فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ سچا قوم پرست وہ ہو گا کہ اگر وقت آئے تو اپنے قوم و وطن کی خاطر سینے پر بم باندھ کر کسی جہاز کی چمنی کے اندر اتر جائے۔ اسے معلوم ہے کہ جب یہ بم پھٹے گا تو اس کے اس طرح پرخچے اڑیں گے کہ کسی کو اس کی ایک بوٹی تک دستیاب نہ ہو گی لیکن وہ مطمئن ہے کہ اس کی جان کی قربانی سے جہاز تباہ ہو جائے گا اور دشمن کا عظیم نقصان ہو گا۔ وہ واقعتاً سچا قوم پرست ہے۔ تو جہاں سچائی ہو گی' خلوص ہو گا' جہاد لازمی طور پر ہو گا۔

اب ذرا اسی کو آپ اپنے اوپر منطبق کرنے کے لئے تیار ہو جائیں؟ کیونکہ لینے اور دینے کے باٹ ایک جیسے ہونے چاہئیں' ورنہ بہت بڑی وعید ہے۔ سورۃ المطففین قرآن مجید کی بڑی

اہم مکی سورۃ ہے۔ اس کی ابتدائی آیات یہ ہیں۔
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ ۔ ہلاکت ہے' تباہی ہے' بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو ناپ اور تول میں کمی کرتے ہیں کہ جب ناپ اور تول کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔ آپ اس مارکسسٹ پر جو اپنے نظریے سے مخلص نہیں ہے بڑے کھلے دل سے اور بڑے دھڑلے سے جو حکم لگاتے ہیں ذرا اسی بات میں اپنے آپ کو تولئے۔ جو شخص غیر اسلامی ماحول میں سانس لے رہا ہو اور اسے بدلنے کی جدوجہد نہ کرے اس کی زندگی جہاد سے خالی ہو' اس میں وہ کشمکش' وہ بھاگ دوڑ' وہ محنت و مشقت اور وہ ایثار و قربانی نظر نہ آئے جو انقلاب اسلامی کے لئے لازمی و لابدی ہے تو ذرا اس پر بھی وہی فتویٰ لگائیے کہ جھوٹ موٹ کے مسلمان بنے پھرتے ہیں' صرف ذہنی تعیش کے طور پر اسلام کا نام لیتے ہیں' یہ حقیقی مومن نہیں ہیں۔ سچا مومن تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو اپنی جان اور مال اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے' اللہ کے کلمے کو سربلند کرنے کے لئے' اللہ کے جھنڈے کو اونچا کرنے کے لئے اور اللہ کے احکام کی تنفیذ کے لئے کھپا رہا ہو۔ "جہاد فی سبیل....." کی اصطلاح ہم نے مختلف مثالوں کے ذریعے سمجھی ہے کہ جہاد کسی نہ کسی نصب العین (CAUSE) کے لئے ہوتا ہے۔ تو اللہ کے لئے جو جہاد ہو گا وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔

جہاد میں مال و جان کی قربانی لازمی ہے

جہاد فی سبیل اللہ کے مختلف مراحل اور مراتب ہیں' جو بعد میں بیان ہوں گے۔ اب یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ اس جہاد میں' جہد و کوشش میں' اس کشمکش میں انسان کے پاس وہی تو چیزیں ہیں جو وہ لگا سکتا ہے۔ ایک اپنا مال اور دوسری اپنی جان۔ چنانچہ کسی بھی نظریئے کو پھیلانا ہو' کسی خیال کی اشاعت مطلوب ہو' کسی پیغام کو دنیا میں عام کرنا ہو تو اس کے لئے اولین چیز تو پیسہ ہے جو صرف ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جسم اور جان کی صلاحیتیں' قوتیں اور توانائیاں لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ اوقات بھی لگتے ہیں لیکن میں وقت کو تیسری چیز کے طور پر نہیں گن رہا' کیونکہ وقت درحقیقت پیسہ ہی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں اس کی کہیں علیحدہ وضاحت نہیں ملے گی۔ اس کو کہیں الگ شمار نہیں کیا گیا۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے اور آج کے دور میں آ کر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے۔ وقت ہی تو پیسہ ہے۔ (TIME IS MONEY)

وقت کو جب آپ اپنی جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ضرب دیتے ہیں تو پیسہ بناتے ہیں۔ چنانچہ وقت اب سرمایہ (CAPITAL) ہی کی ایک صورت ہے۔ آپ نے وقت صرف کر کے پیسہ بنایا ہے۔ اگر پیسہ دے دیا تو گویا کہ وقت صرف کیا۔ اور اگر پیسہ موجود ہے تو کسی مقصد کے لئے کسی کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تو یہ دونوں باہم مبادلہ پذیر اجناس (INTERCONVERTIBLE COMMODITIES) ہیں۔ لہٰذا مال میں وقت کو بھی شامل سمجھ لیجئے۔

کسی جدوجہد میں مال کے علاوہ جو چیز درکار ہوتی ہے وہ جسم و جان کی صلاحیتیں' توانائیاں اور قوتیں ہیں۔ قرآن ان سب کو ایک لفظ "نفس" میں جمع کر لیتا ہے۔ چنانچہ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ کا مفہوم ہو گا کہ جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور اس میں کھپاؤ اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی' اپنے اوقات' اپنی توانائیاں اپنی صلاحیتیں' اپنی قوتیں' اور اپنی ذہنی و عملی استعدادات اس راہ میں لگا دو یہاں تک کہ جب وقت آ جائے تو نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں آ جاؤ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایمان کا مقصد معیّن ہو جائے کہ محض قانونی سطح پر مومن و مسلم کہلوانے کے لئے نہیں بلکہ آخرت میں سرخروئی کے لئے مومن بننا ہے اور جہنم سے چھٹکارا پانا ہے تو اس کے لئے جہاد سے مفر نہیں ہے۔ اس پر سورۃ الصف کی ان آیات کی طرف ذہن کو متوجہ کیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

"اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس تجارت کی طرف جو تمہیں عذاب الیم سے چھٹکارا دلا دے؟" اہل ایمان سے یہ سوال کیا گیا۔ پھر آگے اس کا جواب دیا گیا۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت عام ہے کہ سوال کر کے پھر اس کا جواب دینا۔ حضورؐ نے بھی یہ اسلوب کثرت سے اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً اتدرون من المفلس؟ "جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟"۔ سوال کیا' پھر جواب عنایت فرمایا۔ اسی طرح سوال کیا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کے اللہ پر کیا حقوق ہیں اور اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں؟" پھر جواب میں اس کی وضاحت فرمائی۔ تو یہ اسلوب قرآن و حدیث میں بہت عام ہے۔

یہاں سورۃ الصف میں بھی یہی اسلوب ہے۔ پہلے سوال کیا گیا۔

"کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف جس کا نفع یہ ہے کہ عذاب الیم سے چھٹکارا پاجاؤ؟" دیکھئے' انسانی ذہن کے کس قدر قریب آکر بات کی گئی ہے۔ کوئی بھی کاروبار ہو اس سے مقصود منفعت ہوتی ہے۔ پھر ہر شخص جانتا ہے کاروبار میں دو چیزیں لگتی ہیں' کچھ سرمایہ اور محنت۔ اس کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ چھوٹی سی چھابڑی کے لئے بھی سوپچاس کی کوئی چیز اور ایک شخص کی صبح سے شام تک کی محنت درکار ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے کاروبار میں بھی سرمایہ اور محنت دونوں چیزیں کھپتی ہیں تو کچھ منفعت حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا تمہیں وہ کاروبار بتادیا جائے جس کی منفعت دردناک عذاب سے چھٹکارا پاجانا ہے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ "ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر"۔ ترجمہ میں "پختہ" کا لفظ اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ خطاب "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے ہورہا ہے۔ یعنی ان لوگوں سے خطاب ہے جو قانوناً مومن اور مسلم تھے۔ اب ان سے کہا جارہا ہے۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ..... "اللہ اور اس کے رسولؐ پر حقیقۃً ایمان لاؤ"۔ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ"۔ یعنی ہر کاروبار کی طرح اس کاروبار میں بھی سرمایہ اور محنت' مال اور جان کھپانا پڑیں گے۔

ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ "یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو"۔ چنانچہ اس بحث کا حاصل یہ ہوا کہ ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ لازم و ملزوم ہیں اور جہاد میں مال اور جسم و جان کی توانائیاں کھپتی ہیں۔

(جاری ہے)

ضرورت رشتہ

ارائیں خاندان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ (ایم اے انگلش)، دراز قد، وجیہہ، دینی مزاج اور سوچ کے حامل نوجوان کے لیے جو آجکل حصول تعلیم (رجسٹرڈ اکاؤنٹنٹ) کی خاطر انگلینڈ میں مقیم ہیں، ہم پلّہ، خوبصورت، دراز قد، گھریلو کام کاج سے کماحقہ، واقف' ایم اے تک تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ صاف گوئی، راست معاملگی، رسومات سے اجتناب' اسلامی ذہن اور سوچ ہماری اوّلین شرائط ہیں۔ راولپنڈی / اسلام آباد کے رہائشی خاندان قابل ترجیح ہونگے۔
شادی دفاتر قطعی طور پر زحمت نہ فرمائیں۔ معرفت ماہنامہ' میثاق' لاہور

آخرت پر ایمان

محمد غوری صدیقی

دینِ اسلام کی اساس "ایمان" پر ہے اور اس ایمان کے تین بنیادی عناصر ہیں۔

(۱) ایمان باللہ۔ اللہ (یعنی اس کی توحید اور اس کی تمام صفات) پر ایمان۔

(۲) ایمان بالرسالت۔ انبیاء ورسل پر عموماً اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر خصوصاً ایمان جس میں فرشتوں اور کتابوں پر خصوصاً قرآن پر ایمان شامل ہے۔

(۳) ایمان بالآخرۃ۔ مرنے کے بعد (عالم برزخ پر) دوبارہ زندہ ہونے اور یوم قیامت یا یوم حشر پر ایمان جس میں اعمال کی جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر ایمان شامل ہے۔ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد یہی تینوں "ایمانیات" ہیں۔ لیکن انسان کو نیک اعمال پر کاربند ہونے کی ترغیب و تشویق دلانے اور مجبور کر دینے والی شے یعنی جذبۂ محرکہ یہی آخرت پر ایمان ہے۔ اگر یوم جزا و سزا پر یقین حاصل نہ ہو تو اللہ کو عالم الغیب اور قادر مطلق اور رسولؐ کو بہترین نمونۂ زندگی تسلیم کرنے کے باوجود انسان نہ نیکی کی طرف راغب ہو سکتا ہے اور نہ بدی سے باز آ سکتا ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفقاء نے اللہ تعالیٰ کے دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ انقلاب پر سربلند کرنے اور قائم کرنے کا عزم کیا ہے لیکن ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس راہ کے مصائب و شدائد جھیلنے اور ثابت قدم رہنے کے لئے آخرت کی باز پرس اور انعامات کا یقین ہونا لازمی ہے۔ اس راہ میں سست روی، تساہل پسندی، بچ بچ کر اور کنارے کنارے چلنے کی روش اس اخروی زندگی پر تذبذب اور بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

انسان کی فطرت میں نفع کی طرف میلان اور نقصان سے اجتناب مضمر ہے۔ اس کی تمام تر سعی و

جہد اسی نفع و نقصان کی شرح اور تناسب سے وجود میں آتی ہے۔ اگر آخرت کے نفع، نقصان کی وسعت و ہمہ گیریت، اور اس کی مقدار سمجھ میں آکر یقین کا درجہ اختیار کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جانثار صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چل کر آج کا مسلمان پھر وہی تاریخ نہ دہرائے۔ کہ ؎

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

اور ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

"جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ" کا یہ غلغلہ انہی نفوسِ قدسیہ نے بلند کیا تھا جو آج تاریخ میں صحابہ کرامؓ کے نام سے موسوم ہیں جن کا قول تھا کہ اگر جنت اور دوزخ ہمارے سامنے بھی آجائیں تو ہمارے ایمان میں مزید کوئی اضافہ نہ ہو گا کیونکہ یقین کی آنکھوں سے ہم ان کو پہلے ہی دیکھ رہے ہیں۔

اعمال کے لوازم اور نتائج...... جس طرح دنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے اعمال کے بھی کچھ اثرات و لوازم ہیں جو ان سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ جس طرح سنکھیا سے اس کا زہریلا پن، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت دور نہیں کی جا سکتی اسی طرح غرور و خاکساری، بخل و فیاضی، انتقام و درگزر، شجاعت و بزدلی اور ایمان و کفر سے اُن کے لازمی اثرات و نتائج دور نہیں کئے جا سکتے۔ ہر عمل کا ایک اپنا اثر اور نتیجہ ہے۔ یہی اثر اور نتیجہ اعمالِ نیک و بد کرنے والوں کو آخرت میں دے دیا جائے گا۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ، ۲۸) جو کچھ تم کرتے تھے آج وہی بدلہ میں پاؤ گے۔ گویا جزا و سزا دراصل ہمارے ہی نیک و بد اعمال کے ردِ عمل کا نام ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ہے۔ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (طٰہٰ، ۱۰) تاکہ ہر جان (انسان) کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کیا۔ فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (النحل ۳۴) پس ان کے برے کام اُن پر پڑے اور ان کا مذاق اڑانا ان پر الٹ پڑا۔ غرض یہ کہ آخرت کی جزا و سزا ان ہی دنیوی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔

حصولِ عیش و راحت کا اصول..... فطری قانون جس کا ہم سب خود اس دنیوی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں یہ ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اُسی وقت بچ سکتے ہیں جب اُس کی خاطر چھوٹی چھوٹی تکالیف برداشت کریں اور بڑی خوشی کو اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب اس کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیاں قربان کریں۔ قرآن کریم میں دنیا کو عاجلہ (جلد ملنے والی) اور موت کے بعد کی زندگی کو آخرۃ (بعد میں آنے والی) کہا گیا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی کچھ چیزیں جلد مل جاتی ہیں اور کچھ کے لئے انتظار اور صبر کرنا پڑتا ہے۔ پست خیال اور کم ہمت لوگ فوری فائدوں کو ترجیح دے کر دنیا کے دیرپا اور بڑے فائدوں سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن بلند ہمت و عالی حوصلہ لوگوں کا طرزِ عمل اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ فاتح اور کشور کشا اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالتے ہیں تاکہ سلطنت اُن کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ کل کو دولت میں کھیلیں۔ کسان اپنی گندم کا بیج آج مٹی میں ملا دیتا ہے تاکہ کل کو اس کی کوٹھیاں دانوں سے بھر جائیں۔ ہر مذہب و ملت کا انسان اپنے بچے کو بیس پچیس سال تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی بھٹی میں خوشی خوشی جھونک دیتا ہے تاکہ دنیا میں اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو۔ یہ انسان اس لئے کرتا ہے کہ اس کو یہ دنیا میں ہوتا نظر آتا ہے اور اس کو اس پر یقین ہو چکا ہے۔ اگر یہی یقین آخرت پر اور جنت و دوزخ پر ہو جائے تو ہم یقیناً جنت کے لئے (جو کہ رضائے الٰہی کا انعام ہے) اس دنیا کی ہر تکلیف اور ہر نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں گے اور دوزخ سے (جو اللہ کی ناراضگی کی سزا ہے) بچاؤ کی خاطر اس عارضی دنیا کا ہر نفع، لذت اور عیش و راحت قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صبر و استقامت سے ہی ممکن ہے۔ بفحوائے قرآن کریم:

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا (الدھر) اور اللہ نے ان کو صبر کرنے پر مزدوری عطا فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

حُفّت الجنّة بالمكاره وحفت النّار بالشّهوات

جنت کے گرد دنیاوی تکالیف اور ناگوار چیزوں اور جہنم کے گرد لذات دنیا اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ (النازعات)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

آخرت کی صداقت کے برحق ہونے کے دلائل..... قرآن حکیم نے قیامت اور مرنے کے بعد دوسری زندگی پر نفسِ لوّامہ کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" ○

"اور نہیں (تمہارا انکار قیامت غلط ہے) میں نفس لوامہ کو (قیامت پر) گواہ کے طور پر پیش کرتا ہوں"۔ نفس لوامہ انسان کی وہ باطنی حقیقت ہے جس کو ضمیر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو کہ نیکی کی ترغیب دیتا ہے اور برائی پر ٹوکتا ہے۔ انسان کے اندر نیکی اور بدی کی پہچان رکھی گئی ہے بفحوائے الفاظ قرآنی۔ "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" اب نیکی اور بدی کا نتیجہ بھی لازماً نکلنا چاہئے ورنہ انسان کو ان کا شعور دینا لاحاصل قرار پائے گا۔

چونکہ دنیا میں نیک و بد اعمال کے نتائج یا تو نکلتے نہیں یا اعمال کے تناسب سے نہیں نکلتے بلکہ اکثر اوقات نیکی و اصول پرستی کا نتیجہ الٹا مصیبتوں، تکالیف اور تنگی و ترشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بے اصول، بدکار، اور جھوٹے کاروبار میں ملوّث لوگ یہاں عیش کرتے اور بظاہر نعمتوں میں کھیلتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ عدل و انصاف کی خاطر دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہئے جہاں ان اعمالِ نیک و بد کے تناسب سے ان کے نتائج نکلیں۔ اگر آخرت نہ ہو تو نیک و بد برابر ہو جائیں گے اور قرآن میں اللہ تعالیٰ اس کی نفی اس طرح کرتے ہیں۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ (القلم)

کیا ہم مسلمانوں (فرمانبرداروں) اور مجرموں کو ایک جیسا کر دیں گے تم کو کیا ہوا ہے کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ ——— اور اگر ایسا ہو تو یہ پوری کائنات اندھیر نگری، چوپٹ راجہ قرار پائے گی۔ قرآن کریم میں اس کائنات کی تخلیق کے مقصد کے متعلق ارشاد ہے۔ اس کائنات میں تو ایک ذرہ بھی بیکار نہیں ہے۔

چنانچہ انسان اور انسانی اعمال کیسے بیکار اور بے نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے ان ہی انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور میں آنے کا دوسرا نام آخرت ہے۔

اب اس دنیا کی ہر چیز محدود ہے۔ اس کی زندگی مختصر، اس کی لذتیں عارضی، اس کی کلفتیں اور تکالیف محدود ہیں۔ یہاں کسی کو اس کے جرم کے مقدار و معیار کے مطابق سزا دی

ہی نہیں جاسکتی۔ ہٹلر، چنگیز خان جن کی وجہ سے کروڑوں بندگانِ خدا خاک و خون میں تڑپے، انسانیت جن کے جرائم و اعمال بد کی وجہ سے آج تک سسک رہی ہے۔ دنیا میں ان کو کیا اور کتنی سزا دی جاسکتی تھی۔ آخرت کی لامتناہی اور نہ ختم ہونے والی زندگی میں دنیا کے یہ عارضی اور محدود قوانین نہ ہوں گے۔ از روئے قرآن:

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، عنقریب ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے۔ جیسے جیسے ان کی کھالیں جلتی جائیں گی ہم ایک نئی کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔" (النساء۔ ۵۶)

یعنی سلسلۂ عذاب کبھی ختم نہ ہوگا۔ دنیا میں کھال جل جانے کے بعد تکلیف کا احساس بوجہ بے ہوشی یا موت ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں موت بھی نہ ہوگی۔

دوبارہ زندگی کے ناممکن ہونے کا اعتراض کم عقلی کی نشانی ہے۔ جب اللہ نے انسانوں کو پہلی مرتبہ پیدا کر دیا تو دوسری مرتبہ کیا مشکل ہے۔ ویسے بھی کسی چیز کو پہلی مرتبہ بنانا مشکل اور دوسری مرتبہ بنانا آسان ہوتا ہے۔ اسی واسطے دلیل کے طور پر فرمایا گیا۔

اَفَعَیِینَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (ق) کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے کے بعد عاجز آ گئے ہیں؟

جہاں تک جنت اور دوزخ کا تعلق ہے۔ تو جس خدا نے چاند، سورج اور ان سے کروڑوں گنا بڑے ان گنت سیارے بنائے، اس کے لئے دوزخ جنت بنانا کیا مشکل ہے۔

پھر یہ کہ "انسان نے اس دنیا کی زندگی میں جتنے عمل کئے ہیں ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہے اور وہ حشر کے دن پیش ہوگا"۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس کا ثبوت آج ہم کو اس دنیا میں بھی مل رہا ہے۔ ہم کیمرہ سے حرکات اور ٹیپ ریکارڈر سے آوازوں کو محفوظ کر کے جب چاہتے دیکھ اور سن سکتے ہیں تو اللہ کے لئے تو یہ کہیں زیادہ آسان ہوگا۔

مؤمنین کا صبر و ثبات..... مومن کو جو کچھ دنیا میں ملتا ہے جب تک اس کو اللہ کے احکام کے مطابق لگا کر کھپا نہ دے حقیقی مومن شمار نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ)

بے شک اللہ نے مؤمنین کے جان اور مال خرید لئے ہیں جنت کے بدلے میں۔

سورۃ العصر میں تمام بنی نوع انسان کے خسارے کا بیان ہوا ہے۔ اور اس خسارے سے بچنے کے لئے جو چار اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کے حامل انسان دنیا میں قربانیاں دیتے اور

تکالیف و مصائب بھیلتے بھیلتے موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں اور حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

" زمانہ گواہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان یقیناً تباہی وہلاکت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک اعمال کئے۔ حق وصداقت کی دعوت مل جل کر دی اور مل جل کر صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کی "۔

یقیناً اس سورۃ مبارکہ میں موت کے بعد آنے والی زندگی کی کامیابی کی شرط اول "صبرو استقامت" بیان ہوئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیاں اور مصائب و شدائد جو آپؐ کی پوری زندگی پر محیط ہیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

حضرت سمیہؓ کو قبولِ اسلام کی پاداش میں ابو جہل ظالم نے نازک مقام پر نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ دنیا میں ان کو کیا ملا۔ یقیناً اُن کا اجر آخرت میں محفوظ ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ غلام تھے اور ان کا آقا دین توحید پر ڈٹے رہنے کی پاداش میں انہیں ننگے بدن مکہ کی سنگلاخ تپتی ہوئی زمین پر گرمی کے موسم میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹتا تھا جس طرح مردہ جانوروں کو بھی نہیں گھسیٹا جاتا۔ لیکن انہوں نے اس دنیا کی تمام تکالیف کو آخرت کی کامیابی کے پیش نظر برداشت کیا۔ حضرت خباب بن ارتؓ کو سلگتے انگاروں پر ننگی پیٹھ کے بل لٹا کر اوپر سے سل رکھ دی جاتی تھی۔ چربی پگھل کر انگاروں کو بجھا دیتی تھی لیکن انہوں نے دل میں روشن نورِ ایمان کی شمع کبھی بجھنے نہ دی۔ ان آخرت کی کامیابی کی خاطر جو کہ رضائے الٰہی کا پیغام ہے۔ حضرت یاسرؓ کے چاروں ہاتھ پاؤں چار سانڈھ اونٹوں کے ساتھ رسّوں کے ذریعے باندھ کر مطالبہ کیا گیا کہ محمدؐ کا ساتھ چھوڑ کر آبائی دین میں واپس آجاؤ تو نہ صرف جان بخشی کر دی جائے گی بلکہ عزت و آرام اور آسائشیں مہیا کر دی جائیں گی۔ اس مردِ مجاہد نے دین حق پر ثابت قدم رہ کر اپنے جسم کے چار ٹکڑے کروالئے انہوں نے دنیا کی زندگی اور عیش ونشاط پر کس کو ترجیح دی؟ یقیناً آخرت کی کامیابی کو۔ حضورؐ نے حضرت حرامؓ کو ایک نامۂ مبارک دے کر جس میں اسلام کی دعوت تھی عامر بن طفیل (جو کہ بنی عامر کا رئیس تھا) کے پاس بھیجا۔ اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ اس نے والا نامہ کو پڑھا بھی نہیں اور ایک نیزہ حضرت حرامؓ کو ایسا مارا جو سینہ سے پار اتر گیا اس وقت ان کی زبان سے وہ جملہ نکلا جو کہ تاریخ میں داستانِ عزیمت کا ایک باب رقم کر گیا' کہ فزتُ برب الکعبۃ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کون سی کامیابی تھی جو اُن پر روشن ہوئی؟ یقیناً آخرت کی کامیابی۔

ایک موقع پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔
"خدا کی قسم تم لوگ جلد گھبرا گئے ہو۔ تم سے پہلی مسلمان امت میں ایسا بھی ہوتا رہا کہ کسی مومن کو پکڑ کر زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور سر پر آرا چلا کر جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ گڑھوں میں آگ دہکا کر مومنوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ مومنوں کو لٹا کر لوہے کے کنگھوں سے زندہ حالت میں ہڈیوں پر سے گوشت کھرچ لیا جاتا تھا اور وہ دین پر قائم رہ کر یہ سب کچھ برداشت کر جاتے تھے"۔ ان مومنین کا اجر بھی یقیناً آخرت کی زندگی میں ہی ملے گا۔

تاریخ انسانی انبیاء و رسل اور ان کے پیروکاروں، صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، اولیائے کرام اور دیگر مصلحین و مومنین کی داستان ہائے عزیمت سے بھری پڑی ہے جو کہ اسی ایک نکتۂ ایماں کی تفسیریں ہی تو ہیں، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور آخرت پر یقین۔ ان حضرات کی تمام تر سعی و جہد کا مرکزی نقطہ آخرت کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا تھا۔ ان حضرات نے دنیا سے جو ملا، اس کو ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی منزلوں سے گزرتے ہوئے لگا دیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جس وقت ایمان لائے بہت کامیاب تاجر تھے۔ چالیس ہزار دینار پر مشتمل سرمایہ موجود تھا۔ یہ سب دعوتِ حق کی راہ میں برف کی طرح پگھل گیا۔

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآرا تصنیف

مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

بقیہ : عرضِ احوال

ہو سکتا کہ پانچ پانچ دن تک پوری قوم ہذیانی کیفیت کا شکار رہتی ہے۔ خدارا اس کھیل کو دیس نکالا دے دیں۔ بہرکیف میرا یہ مشورہ صدا بصحرا ثابت ہوا اور کرکٹ کے معاملے میں ان کی پالیسی جوں کی توں برقرار رہی۔ اس حد تک مجھے بھی ان سے شکایت نہ تھی۔ لیکن بعد میں ایک عرب اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ انہوں نے جس انداز میں کیا وہ خلاف واقعہ ہی نہیں انتہائی توہین آمیز بھی تھا۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں اسے یوں بیان کیا کہ میں اتفاقاً اس مسجد میں نماز کے لئے چلا گیا جہاں ڈاکٹر اسرار احمد نماز پڑھاتے ہیں۔ نماز کے بعد انہوں نے مجمع لگالیا اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں کرکٹ پر پابندی لگادوں۔ ظاہر بات ہے کہ صدر صاحب کا بیان بالکل خلاف واقعہ تھا۔ قدرتی طور پر مجھے ان کے طرزِ عمل پر شدید رنج ہوا۔ لیکن اس ایک واقعے کے علاوہ میری معلومات کی حد تک انہوں نے پبلک میں میرے خلاف اور کوئی بات نہیں کی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آج اس واقعے کا ذکر میں نے صرف اس اعتبار سے کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس زیادتی پر میں نے انہیں صاف دلی سے معاف کیا اور آخرت میں اللہ کے ہاں اس زیادتی پر ان کا محاسبہ نہیں کروں گا۔

آخر میں آپ سے میری استدعا ہے کہ ملک و ملت کے نازک مسائل پر سنجیدگی سے سوچئے۔ یہ ہماری قومی ذمہ داری بھی ہے اور دینی بھی۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کی جڑ اور بنیاد صرف اور صرف اسلام پر قائم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پورے عالم اسلام اور خصوصاً برعظیم پاک و ہند میں اسلام کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح رخ پر سوچنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(۲)

قاضی ظفر الحق

تحریکِ نور بدیع الزمان سعید نورسی

آغاز و ارتقاء..... بدیع الزمان سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ایک سیماب صفت اور بے قرار روح کے حامل فرد تھے اور ان کی بچپن سے لے کر وفات تک کی تمام زندگی از حد پرہنگام اور شوریدہ تھی۔ تاہم وہ رسائل اور وہ تحریک جس نے انہیں ایک تاریخ ساز شخصیت بنا دیا' ان کی زندگی کے آخری پینتیس سالوں کا ثمر ہیں۔

۱۹۲۲ء میں جب سعید نورسی علیہ الرحمۃ مجلس کبیر ملی کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے اور وہاں ترکوں کی کامیابی کے لئے دعا کی تو آپ یہ دیکھ کر نہایت غمگین ہوئے کہ ارکان مجلس میں اسلامی شعائر سے نفور پایا جاتا ہے۔ آپ نے ایک بیان مجلس کے نام لکھ کر کاظم قرہ بکر پاشا کو تھمایا اور خود مجلس سے تشریف لے گئے۔ آپ کے بیان میں اخروی تذکیر اتنی مؤثر تھی کہ مجلس کے ایک سو ساٹھ ارکان نے وہیں اسلامی زندگی بسر کرنے اور پابندی سے نماز پڑھنے کا عہد کیا۔ اس واقعہ سے مصطفیٰ کمال کو تو آگ لگ گئی اور وہ آپ سے الجھ پڑا۔ آپ نے اسے اس کی بداعمالیوں اور آزادروی پر سرزنش کی۔ پھر بددل ہو کر انقرہ سے چلے آئے اور مشرقی ترکی کے ایک گوشہ 'وان' میں عزلت گزیں ہو گئے۔ عملی اور ملکی سیاست سے آپ کو نہایت وحشت ہو چکی تھی چنانچہ آپ نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام کی بنیاد ایمان ہے اور اسلامی زندگی کے احیاء کے لئے ایمان کا ہمہ گیر احیاء ضروری ہے اور اس کا ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ وان میں آپ نے گرد و نواح کے نوجوانوں کو جمع کیا اور انہیں قرآن حکیم کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ آپ کی تعلیم کا انداز اتنا مؤثر تھا کہ جلد ہی طلباء کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور یہ اضافہ یہاں تک بڑھا کہ حکومت نے پریشان ہو کر آپ کو اور آپ کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ آپ کو آٹھ سال کے لئے برلا جیل بھیج دیا گیا۔ تحریک نور کا پودا جو آپ وان میں لگا چکے تھے' اب اپنے قائد اور اس کے روح پرور اور ایمان افروز دروس سے محروم ہو چکا تھا۔ مگر جیل کی دیواریں اس مرد عظیم تر کا راستہ نہیں روک سکتی تھیں۔ سعید

نورسی کے سینہ سے نکلنے والا ایمان کا سیلاب جلد ہی پہرے داروں کے دل کے بند دروازوں پر دستک دینے لگا۔ سعید نورسی علیہ الرحمۃ نے انہیں پہرے داروں کو ایمان کی ترسیل کا ذریعہ بنالیا اور قرآن حکیم کی آیات و سور کی تفسیر پر مبنی نور کی شعاعیں خطوں اور رسالوں کی صورت میں جیل سے نکل کر ظلمت کدۂ ترکی کو روشن کرنے لگیں۔ طلبۂ نور نے اس نورِ ایمان کو ہاتھوں سے نقل کر کے گھر گھر پہنچانا شروع کر دیا کیونکہ پریس میں ایسا "خطرناک" مواد چھپنا ممنوع ہو چکا تھا۔ بعض نوری طلبہ نے اس سلسلہ میں نہایت حیرت انگیز قربانیوں کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خود کو اپنے استاد کی طرح تنہائی میں قید کر لیا اور ان رسالوں کی نقلیں تیار کرنے لگے یہاں تک کہ کئی کئی سال گھروں میں بند رہ کر بتا دیئے ان کی انگلیاں جواب دے گئیں اور ان پر قلموں کے انمٹ نشانات قائم ہو گئے جو یقیناً آخرت کا بڑا سرمایہ ہیں۔

اس دوران حکومت چھاپے مارتی، طلبہ کو گرفتار کرتی اور مقدمہ پر مقدمہ قائم کرتی رہی یہاں تک کہ سعید نورسی علیہ الرحمۃ کی وفات تک حکومت ان پر تیس سالہ عرصہ میں ۴۳۴ بار خفیہ تحریک چلانے، تختہ الٹنے کی سازش کرنے، اصلاحات کی مخالفت کرنے اور دیگر بے سروپا الزامات کے تحت مقدمے چلا چکی تھی۔ مگر حکومتوں کی یہ ساری تگ و دو بادۂ الست کے مے خواروں کی گرمیٔ ذوق اور تپشِ شوق کے آگے ہار گئی۔ مہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ تحریکِ نور دیہاتوں، شہروں، کارخانوں قدیم مدرسوں جدید دجامعات، سرکاری دفاتر یہاں تک کہ فوجی اور نیم فوجی اداروں تک وسیع ہوتی چلی گئی۔ ثروت صولت صاحب کے کہنے کے مطابق یہ تحریک نورسیؒ کی وفات تک دس لاکھ نفوس کو اپنا گرویدہ کر چکی تھی۔

مشہور مقولہ ہے کہ انقلاب دیواروں میں بند نہیں رہتا۔ چنانچہ ایمان کا یہ سیلاب اور کایہ پلٹنے والا یہ انقلاب دیگر اسلامی تحریکوں کے برعکس، جو مسلم معاشروں یا ملکوں میں پھیلیں، یورپ و امریکہ کی طرف بڑھنے لگا۔ آج یہ تحریک جرمنی میں نور انسٹی ٹیوٹ کے نام سے کام کر رہی ہے، جہاں ثروت صولت صاحب کے بیان کے مطابق تیس دینی مدارس میں رسائلِ نور کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ امریکہ میں بھی ترک طلبہ نے ایک ماہنامہ انور جاری کیا ہے، جو ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور وہاں بھی انہوں نے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے، جس کے زیر اہتمام استاذ محترم کی تصانیف اور رسائل کی یورپی زبانوں میں اشاعت ہوتی ہے۔

طلبۂ نور کے کام کا طریقہ..... دنیائے اسلام میں اس وقت جتنی بھی تحریکیں احیائے

اسلام اور تجدیدِ دین کا کام کر رہی ہیں' سب کی سب مخصوص ہیئتِ تنظیمی اور طریقِ کار رکھتی ہیں' سوائے نوری تحریک کے۔ جس کے بانی سیاست سے سخت متنفر تھے اور انجمن سازی کو سیاست ہی کا ایک شاخسانہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ تحریک نور کا مطالعہ کرنے والے کو یہ چیز ورطۂ حیرت میں غرق کر دیتی ہے کہ اس کا نہ تو کوئی امیر ہے نہ مامورین' نہ دستور ولائحہ عمل ہے اور نہ ہی دفاتر و مراکز۔ بانیٔ تحریک کے الفاظ میں یہ تحریک دلوں سے خطاب کرتی ہے اور دلوں میں ہی اس کا قیام ہے۔ لیکن حیرت اس وقت تو دوچند ہو جاتی ہے' جب مختلف معاملات میں طلبہ نور ہم آہنگ و یک سوئے عمل ملتے ہیں۔ یہ یقیناً استاذ نورسی علیہ الرحمۃ کی معجز نما تربیت کا اثر ہی ہے کہ بلا انجمن کے اس تحریک کی فتوحات نہایت سریع اور شاندار ہیں۔ نور طلبہ ترکی میں اسلامی کتب کی اشاعت و ترجمہ کی تحریک کے روحِ رواں ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قدیم ترکی زبان میں لکھا گیا اسلامی لٹریچر بھی جدید ترکی میں منتقل کروایا اور کیا ہے اور عصرِ حاضر کے مفکرینِ اسلام کی کتب بھی نہایت ذوق و شوق سے ہاتھوں ہاتھ لی ہیں اور ہر طرح سے ان کی پذیرائی کی ہے۔ اس طرح گویا دورِ جدید کا وہ ذہن جس نے لاشعوری طور پر اسلام سے پسپائی اختیار کر لی تھی' اب نوری طلبہ کی اس جدوجہد کے نتیجہ میں' ایک بار پھر رجوع الی اللہ کے حیات بخش عمل میں شریک ہو چکا ہے۔

نوری طلبہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جہاں کتب اور رسائل کا جدید ہتھیار استعمال کر رہے ہیں وہیں وہ اسلامی جذبہ کے فروغ کے لئے مساجد' امام و خطیب' انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور تبلیغی و دعوتی مہموں کے اہتمام کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور طلبہ باقاعدگی سے اجتماع کرتے' سالانہ استاذ مرحوم کی برسی مناتے اور مجالسِ ذکر و فکر' دروسِ قرآن' دعائیہ مجلسوں کا انعقاد اور رسائلِ نور کی تعلیم کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

استاذ مرحوم کی برسی کے موقع پر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اس اجتماع میں تعداد بیس بیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

تحریکِ نور کا سیاسی مسلک..... طلبۂ نور کے خود غیر سیاسی ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا صحیح نہیں ہو گا کہ وہ ملک میں ہونے والی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے بالکل ہی لاتعلق رہتے ہیں' کیونکہ سیاسی تبدیلیوں کا اب تک جس جماعت پر براہِ راست اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے وہ نوری ہی ہیں۔ ترکی کی سیاست پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ترکی سیاست میں امریکہ گردی اور یہودی ادارے فری میسن کی دخل اندازی بہت زیادہ ہے اور نوری طلبہ کمیونزم الحاد' فری

میسنز یوں اور شریعت دشمن عناصر کے سخت مخالف ہیں چنانچہ یہ عناصر بھی ان طلبہ کی جان کے لاگو رہتے ہیں اسی لئے ہر فوجی انقلاب میں نوری تختۂ مشقِ ستم بنتے رہے ہیں۔ اس کشمکش کے پیشِ نظر نوری طلبہ ہمیشہ اس سیاسی جماعت کو انتخابات میں ووٹ ڈالتے ہیں جو اعتدال پسند ہو اور سیکولرزم کی تعریف "مذہب دشمنی" کرنے کے بجائے "مذاہب میں عدم مداخلت" کرتی ہو۔ پہلے یہ پارٹیاں دو تھیں یعنی عدالت پارٹی اور ڈیمو کریٹک پارٹی، مگر اب ان میں ایک زیادہ جاندار اسلامی سیاسی پارٹی بھی شامل ہو گئی ہے۔ ہماری مراد نجم الدین اربکان کی ملی سلامت پارٹی سے ہے۔ یہ پارٹی واضح طور پر شریعت کی حکمرانی کا تصور رکھتی ہے تاہم کافی کمزور ہے۔ اگر ملی سلامت پارٹی اور تحریکِ نور میں اتحادِ عمل ہو جائے تو ہم امید کر سکتے ہیں کہ جلد یا بدیر ترکی میں بھی اسلامی انقلاب کی نوید سننے میں آ سکتی ہے۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

مکتبہ الحبیب ۲۴- جاپان مینشن ۲، پریڈی اسٹریٹ **کراچی ۳**

کی اوّلین پیشکش

اِن شاء اللہ العزیز ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ کے پہلے ہفتے میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت

داعیٔ انقلاب

کے نام سے منصہ شہود پر آئے گی جو امیر تنظیم اسلامی پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک پُرتاثیر، ولولہ و فکر انگیز تاحال غیر مطبوعہ **خطاب** پر مشتمل ہے۔

جسے شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت و کاوش نے کتابی صورت دی۔

سول ایجنٹس

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن۔ ۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

مکتبہ انجمن خدام القرآن سندھ ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ۔ کراچی

معدے کی تیزابیت، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے

لیکوڈ
گیسٹوفل

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD – 6

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیئور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان۔
فون: ۳۱۲۷۵۴-۲۲۱۵۹۸

SV ADVERTISING

آدابُ المعاشرہ

شیخ رحیم الدّین

رنج وغم کے مواقع پر بندۂ مومن کا طرزِ عمل

دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو کہ رنج وغم اور تکلیف ومصیبت سے بچا ہوا ہو۔ اور یہ تکالیف وصدمات مسلم وغیر مسلم سب پر برابر آتی ہیں لیکن ان صدمات وآفات پر دونوں کا رویہ جدا جدا ہوتا ہے۔ ایک بندۂ مومن پر جب کوئی آفتِ ارضی وسماوی آتی ہے تو وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بڑے سے بڑے صدمے پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ رب العزت نے یہ جو کچھ کیا ہے اس میں کوئی حکمت مضمر ہے۔ اس سے مسلمان کو یک گونہ روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کافر ایسے مواقع پر ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور مایوسی کا شکار ہو کر بعض اوقات خودکشی کر بیٹھتا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ۔

(الحدید ۲۲-۲۳)

"جو مصائب بھی رُوئے زمین میں آتے ہیں اور جو آفتیں بھی تم پر آتی ہیں وہ سب اس سے پہلے کہ ہم انہیں وجود میں لائیں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی محفوظ اور طے شدہ) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات خدا کے لئے آسان ہے تاکہ تم اپنی ناکامی پر غم نہ کرتے رہو"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"مومن کا معاملہ بھی خوب ہے وہ جس حال میں بھی ہوتا ہے خیر ہی سمیٹتا ہے۔ اگر وہ دکھ

درد یا بیماری و تنگدستی سے دوچار ہوتا ہے تو سکون کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور یہ آزمائش اس کے حق میں خیر ثابت ہوتی ہے اور اگر اس کو خوشی و خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ خوشحالی اس کے لئے خیر کا سبب بنتی ہے۔" (مسلم)

اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ صرف دنیاوی لذات و اموال کو مقصود نہ جانیں بلکہ یہ یقین رکھیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ اگر مال جائے یا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو صبر سے کام لے اور یہ سمجھے کہ مال اور عزیز و اقارب اور اپنی زندگی ہر چیز آخرکار ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ہی وارث و مالک ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال: ۴۶) بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی آفت و پریشانی آجائے تو صبر و تحمل کے ساتھ کام لیں اور نماز پڑھ کر اللہ سے مدد مانگے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرہ: ۱۵۳) "اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ بے شک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔"

مصائب و آلام پر صبر کرنے والوں کے لئے تین بہت بڑے اجر بتلائے گئے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ (البقرہ ۱۵۵ : ۱۵۷)

"اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو، وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت، اور یہی ہدایت پانے

والے ہیں۔"

مسلمانوں پر جو بھی رنج و پریشانی آتی ہے اس سے ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایماندار مرد اور ایماندار عورت کے جان و اولاد اور مال میں مصیبت آتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

(جامع الترمذی)

عام طور پر جو آدمی زیادہ صالح ہوتا ہے اس پر آزمائشیں بھی زیادہ آتی ہیں مگر اس کو اللہ رب العزت صبر کی بھی خوب توفیق عنایت فرماتا ہے۔

حضرت مصعب بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! کن لوگوں پر زیادہ آزمائش آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: انبیاء علیہم السلام پر پھر ان سے جو مشابہ ہوں پھر جو ان سے مشابہ ہوں (یعنی جو زیادہ تابعدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں)۔ انسان پر اس کے دین کے مطابق ابتلاء آتا ہے اگر وہ اپنے دین میں نرم ہو تو اس پر دین کے مطابق آزمائش ہوتی ہے۔ بندے پر آزمائش جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے زمین پر اس طرح چھوڑتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

(جامع الترمذی)

دکھ درد میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ دوستوں اور عزیزوں کے رنج و غم میں شرکت کرنی چاہیئے، اس طرح ان کے غم کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"سارے مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف میں ہوتا ہے (مسلم)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ:

"جس شخص نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کی تو اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا کہ خود مصیبت زدہ کو ملے گا۔"

(ترمذی)

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے مسلمان بھائی کے جنازے میں شرکت کریں۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص جنازے میں شریک ہوا اور جنازے کی نماز پڑھی تو اس کو ایک قیراط بھر ثواب ملے گا اور جو نماز جنازہ کے بعد دفن میں بھی شریک ہوا تو اس کو دو قیراط ملیں گے۔ کسی نے پوچھا دو قیراط کتنے بڑے ہوں گے؟ فرمایا دو پہاڑوں کے برابر۔

(بخاری و مسلم)

رنج و غم کی شدت، مصائب کے نزول اور پریشانی و اضطراب کے مواقع پر یہ دعائیں پڑھنی چاہئیں۔ حضرت سعد بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پروردگار سے جو دعا مانگی تھی وہ یہ تھی:

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ"

پس جو مسلمان بھی اپنی کسی تکلیف یا تنگی میں خدا سے یہ دعا مانگتا ہے خدا اسے ضرور قبولیت بخشے گا۔

حضرت ابوموسیٰؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ ولا ملجا من اللہ الا الیہ" یہ کلمہ ننانویں بیماریوں کی دوا ہے۔ سب سے کم بات یہ ہے کہ اس کا پڑھنے والا رنج و غم سے محفوظ رہتا ہے۔

اسلام نے بے صبری دکھانے، بین کرنے، ماتم کرنے اور اسی طرح کے دوسرے کام کرنے کو جاہلیت کی علامت قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی مصیبت و آفت کے وقت اپنے گالوں پر تھپڑ مارے، اور گریبانوں کو چاک کرے، اور جاہلیت کی سی باتیں کرے وہ ہم میں سے نہیں (صحیح البخاری)

البتہ اگر صدمہ اور غم کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور زبان سے کوئی بات اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ نکلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے پاس آئے اس وقت حضرت ابراہیم پر حرارت

کا عالم طاری تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ بھی رونے لگے؟" حضورؐ نے فرمایا: "اے ابن عوف! یہ رحمت ہے۔" پھر مزید آنسو نکل پڑے۔ آپؐ نے فرمایا: "بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے اور ہم صرف وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو" اور اے ابراہیم میں تیرے فراق میں غمگین ضرور ہوں"۔ (صحیح البخاری)

بہر حال ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کرے اور کوئی وقت بھی شکر اور صبر سے خالی نہ رہے۔ بلکہ اکثر چاہیئے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ بھلائی و عافیت کی دعا کرے۔ یعنی یہ کہا کرے کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ آمین یارب العالمین!

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

قربِ الٰہی کے دو مراتب
کتاب و سُنّت کی روشنی میں

اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے

سفید کاغذ، عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۹۶، ہدیہ -/۱۰ روپے
شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

رُوح افزا لیموں

برسات میں سب کے لیے موزوں

رُوح افزا کو لیموں کی اضافی لذّت سے لذیذ تر بنایئے

موسم بدلے تو انسانی مزاج بھی ذائقے میں تبدیلی چاہتا ہے۔ برسات سے پوری طرح لطف اٹھانے اور موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے رُوح افزا میں لیموں کا تازہ رس شامل کیجیے اور ایک نئے ذائقے کا لطف اٹھایئے۔

یہ رُوح افزا سکنجبین آپ کے ذوق اور ذائقے کو تسکین فراہم کرے گی اور جسم و جان کو سکون اور فرحت بخشے گی۔

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال

مشروبِ مشرق رُوح افزا

رُوحِ پاکستان

ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

اسرارِ اخلاق
خدمت خلق رُوح اخلاق ہے

ADARTS-HRA-7/86

● اُردو صحافت میں ایک بیباک اور بامقصد آواز

● ایک انقلاب آفریں سیاسی ہفت روزہ

● اسلام اور پاکستان سے وابستگی کی علامت

ہفت روزہ

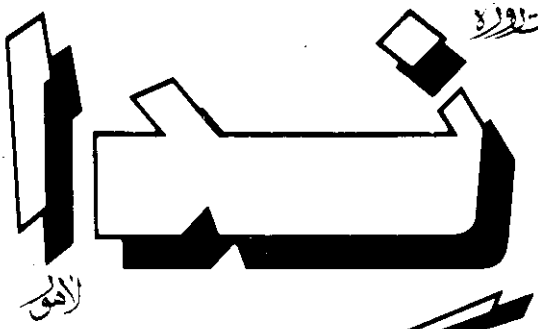

باقاعدگی کے ساتھ ہر بدھ کو شائع ہوتا ہے

مقامِ اشاعت

۱۲۔ افغانی روڈ۔ سمن آباد۔ لاہور ۵۴۵۰۰

زرتعاون برائے سال۔/۲۵۰ روپے، برائے چھ ماہ۔/۱۳۰ روپے، برائے تین ماہ۔/۶۵ روپے

بیرونی ممالک کے لیے:

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات : -/۵۰ امریکی ڈالر

بھارت اور بنگلہ دیش : -/۴۰ امریکی ڈالر ـــــ افریقہ و ایشیا : -/۴۵ امریکی ڈالر

یورپ : -/۵۰ امریکی ڈالر ـــــ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا : -/۵۵ امریکی ڈالر

حدیثِ مبارکہ

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ خَلَعَ یَدًا مِنْ طَاعَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا حُجَّۃَ لَہٗ وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً (مسلم)

جس شخص نے اطاعت سے پہلوتہی کی وہ اللہ تعالےٰ سے قیامت کے روز اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اُس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں مرا کہ اُس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

عطیہ اشتہار: عبداللہ نفیس، سرگودھا

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مرکز

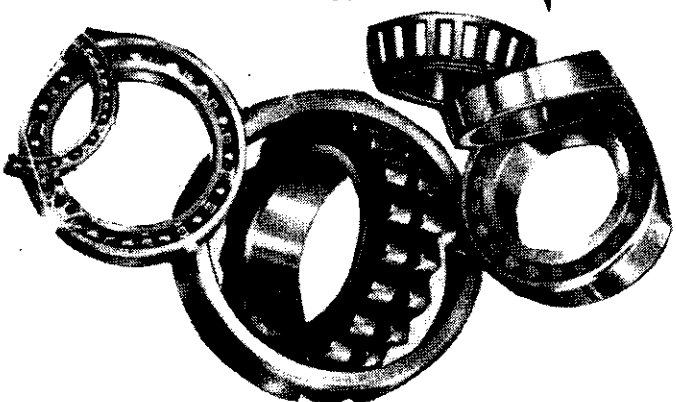

سندھ بیرنگ ایجنسی ۶۵۰۔ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز۔ کراچی، فون: ۷۲۳۳۵۸، ۷۲۱۱۷۲

خالد ٹریڈرز۔ بالمقابل کے۔ ایم۔ سی ورکشاپ۔ نشتر روڈ۔ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ — ۷۳۲۹۵۲ — ۷۳۰۵۹۵

ان شاء اللہ العزیز

تنظیم اسلامی حلقۂ سرحد کا

علاقائی اجتماع

۱۱ ستمبر ۸۸ء تا ۱۳ ستمبر

جامع مسجد سپین جماعت (سفید مسجد) یونیورسٹی ٹاؤن پشاور میں منعقد ہوگا

- ۱۱ ستمبر کو صبح ۸ بجے اجتماع کا آغاز ہوگا۔
- بیرون حلقہ سے شرکت کے خواہشمند رفقاء و تنظیم ۹ ستمبر تک اپنی شرکت کی حتمی اطلاع سے جناب اشفاق میر صاحب امیر تنظیم اسلامی پشاور کو درج ذیل پتہ پر آگاہ کریں!

عیسیٰ نور پلازہ، بالمقابل کالمیکس پٹرول پمپ، یونیورسٹی روڈ، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور۔ فون: ۴۱۸۶۱

المعلم: میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد، ناظم حلقہ سرحد

۵۰ سالہ تجربہ کے حامل

خوبصورت +

پائیدار + گارنٹی شدہ

ایس اے پنکھے

S.A FANS

جی۔ ٹی روڈ، گجرات فون 7147_4700

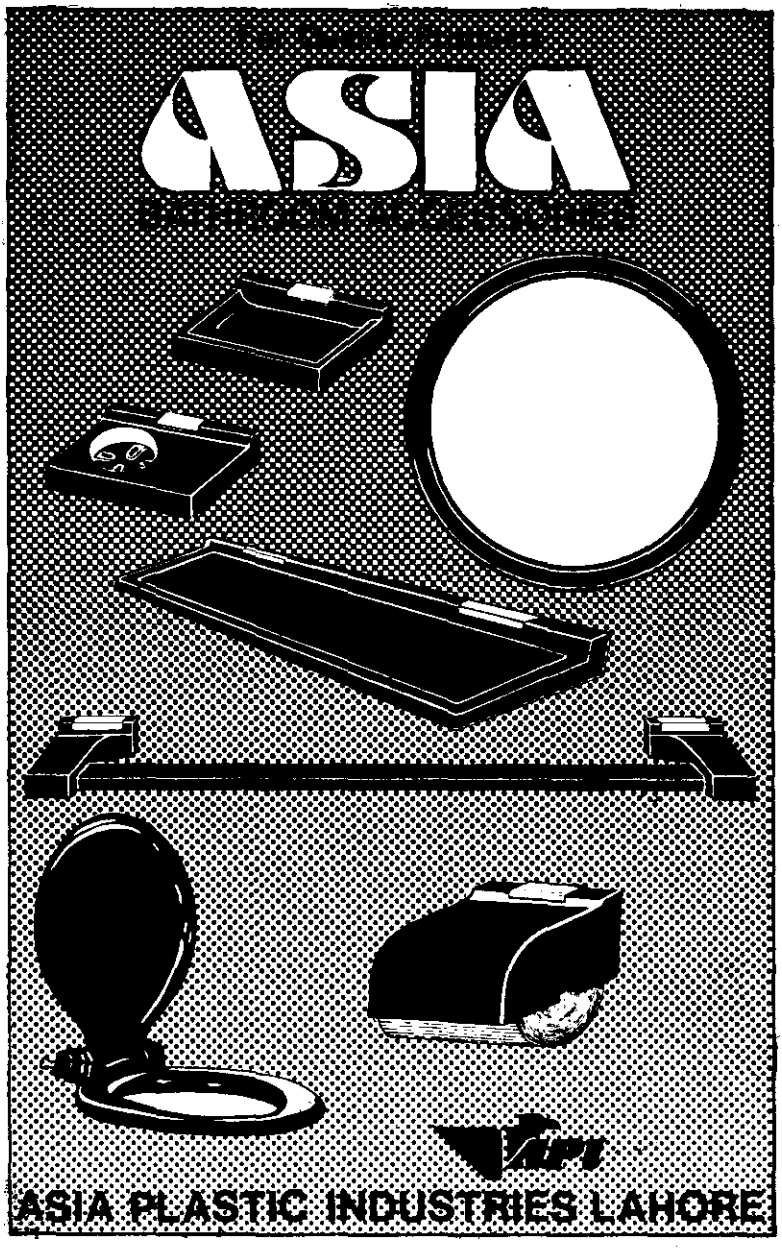
ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ٥

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار

میاں عبدالواحد

نگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

داخلے مطلوب ہیں

دینی تعلیم کا ایک سالہ تدریسی نصاب

قرآن اکیڈمی لاہور میں اِس سال بحمد اللہ دینی تعلیم کے ایک سالہ تدریسی منصوبے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ایک سال میں دیگر علوم دینیہ سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو قواعد عربی کی پختہ بنیادوں پر تعلیم کے ذریعے عربی زبان کی اتنی استعداد بہم پہنچائی جائے گی کہ معمولی سی اضافی کوشش اور مشق کے بعد قرآن حکیم کو ترجمے کی مدد کے بغیر براہِ راست سمجھنا ممکن ہو گا۔ انشاء اللہ۔

طالبانِ علم قرآن کے لیے یہ نصاب ان شاء اللہ العزیز ایک مضبوط بنیاد کا کام دے گا۔ مزید برآں اُن گریجویٹ طلبہ کے لیے جو ایم اے (عربی یا اسلامیات) میں داخلے کا ارادہ رکھتے ہوں اور ابھی داخلوں کے انتظار میں ہوں، عربی زبان اور دینی علوم سے متعارف ہونے کا یہ بہترین موقع ہو گا۔

اس کورس میں :

- ★ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ وہ طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں جو بی اے یا کسی مساوی امتحان کے نتیجے کے منتظر ہوں۔
- ★ ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے اخراجات میں رعایت کی گنجائش ہو گی۔
- ★ بیرون لاہور سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔
- ★ داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ ستمبر ۸۸ء ہے۔
- ★ اوقاتِ تدریس صبح ۸ تا دوپہر ایک ہوں گے۔

تفصیلات خط لکھ کر طلب کریں۔

المعلن : قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

Jawad

We are manufacturing and exporting ready made gar-ents (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, iiforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, ıtton bags, textile piece goods etc.

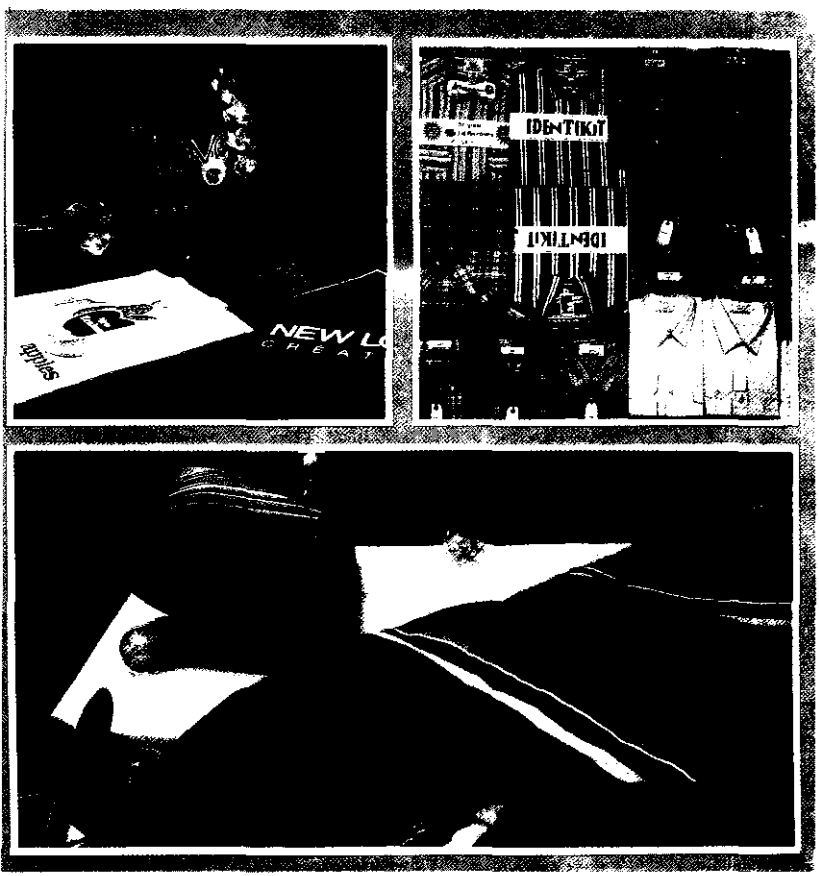

For further details write to .

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
V/C/3-A (Commercial Area),
Vazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220 616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No. 9
SEPTEMBER 1988

اِن شاء اللہ العزیز

تنظیم طلبائے اسلامی

کا پہلا آل پاکستان کنونشن

درج ذیل پروگرام کے مطابق لاہور میں منعقد ہو گا

—(۱)—

۱۴ ستمبر ۸۸ء بروز بدھ، بعد نماز مغرب تا عشاء بمقام جناح ہال لاہور (شاہراہِ قائد اعظم بالمقابل اولڈ کیمپس)

اجلاسِ عام کا انعقاد کیا جائے گا جس میں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

خطاب فرمائیں گے

—(۲)—

مندوبین (تنظیم اسلامی سے باضابطہ منسلک طلبہ) کا ایک

خصوصی اجتماع ۱۵ ستمبر ۸۸ء بروز جمعرات صبح ۸ تا دوپہر ایک بجے

قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہو گا۔ جس میں

اظہار خیال اور مشورے کے بعد ضروری فیصلے کیے جائیں گے

—(نوٹ)—

(۱) تنظیم اسلامی سے منسلک طلبہ کے علاوہ ایسے طالب علم بھی بطور مبصر اس اجلاس میں شریک ہو سکیں گے جو تنظیم اسلامی کے فکر اور اس کے طریق کار سے بحیثیتِ مجموعی اتفاق رکھتے ہوں۔

(۲) بیرونِ لاہور سے تشریف لانے والے شرکاء ۱۲ ستمبر سے قبل اپنے پروگرام سے مرکزی دفتر کو آگاہ کریں۔

(۳) مندوبین کے قیام و طعام کا انتظام قرآن اکیڈمی ۳۶۰۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہو گا۔

(۴) شرکاء کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ ۱۴ ستمبر کو نماز عصر سے قبل قرآن اکیڈمی پہنچ جائیں۔ بصورت دیگر براہِ راست جناح ہال تشریف لائیں۔

المعلن: چوہدری غلام محمد معتمد عمومی تنظیم اسلامی پاکستان
۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔ فون: ۳۰۵۱۱۰